تدبّر

زیرِ نگرانی

مولانا امین احسن اصلاحی

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبّرِ قرآن و حدیث

لاہور۔ پاکستان

اھم اعلان

مولانا امین احسن اصلاحی کی درج ذیل معرکۃ الآراء تصانیف کے مکمل نظرثانی شدہ جدید ایڈیشن الحمدللہ شائع ہوگئے ہیں:

- ○ دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار -/۴۰ روپے
- ○ حقیقتِ نماز -/۲۲ روپے ○ حقیقتِ تقویٰ -/۲۲ روپے
- ○ حقیقتِ شرک و توحید -/۵۶ روپے
- ○ مبادیٔ تدبرِ قرآن -/۳۶ روپے
- ○ قرآن میں پردے کے احکام -/۴۰ روپے
- ○ اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام -/۴۰ روپے
- ○ تزکیۂ نفس ۔ جلد دوم -/۳۶ روپے
- ○ مبادیٔ تدبرِ حدیث -/۳۶ روپے

علاوہ ازیں ان کی مندرجہ ذیل کتب بھی تیاری کے مختلف مراحل میں ہیں جو ان شاءاللہ جلد دستیاب ہوں گی:

- ○ اسلامی قانون کی تدوین
- ○ اسلامی ریاست
- ○ مجموعہ تفاسیر فراہی
- ○ مقالاتِ اصلاحی

فاران فاؤنڈیشن
۱۲۲ا فیروزپور روڈ لاہور
۵۴۶۰۰
فون: ۲۷۳۴۷۷

تدبّر

سلسلہ نمبر ۳۲ ذوالحجہ ۱۴۱۰ھ جولائی ۱۹۹۰ء

فہرست مضامین

تذکرہ وتبصرہ

شریعت بل کی منظوری ــــــ خالد مسعود ۳

تدبرِ قرآن

تفسیر سورۂ اعراف (۲) ــــــ خالد مسعود ۵

اسالیب قرآن: التفات ــــــ خالد مسعود ۱۳

تدبرِ حدیث

پیداوار پر زکوٰۃ ــــــ امین احسن اصلاحی/سعید احمد ۲۴

افاداتِ فراہی

توحید پر قرآن کا استدلال ــــــ خالد مسعود ۳۳

مقالات

فکر کی نارسائیاں ــــــ محمود احمد لودھی ۴۳

تبصرۂ کتب

تزکیۂ نفس ۔ جلد دوم ــــــ پروفیسر عبدالجبار شاکر ۴۵

مجلسِ ترتیب

_____ خالد مسعود (مدیر)
_____ عبد اللہ غلام احمد
_____ ماجد خاور
_____ محبوب سبحانی
_____ سعید احمد

ناشر : _____ ادارہ تدبرِ قرآن وحدیث
رحمان سٹریٹ۔ مسلم کالونی۔ سمن آباد لاہور (۲۵)
مطبع : _____ المطبعۃ العربیۃ ۔ نیک روڈ لاہور
قیمت ۔/۵ روپے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تذکرہ وتبصرہ

خالد مسعود

شریعت بل کی منظوری

یہ بات پاکستان کے دینی حلقوں کے لئے بڑی مسرت افزا اور خوش آئند ہے کہ ملک کی پارلیمینٹ کے ایوان بالا نے ۱۳ مئی ۱۹۹۰ء کو وہ شریعت بل اتفاق رائے سے منظور کر لیا جو سینیٹر قاضی عبد اللطیف اور سینیٹر مولانا سمیع الحق نے تقریباً پانچ سال قبل جولائی ۸۵ء میں منظوری کے لئے پیش کیا تھا۔ اس کی منظوری پر سینٹ کے ارکان اور ڈپٹی چیئرمین کے علاوہ صدر پاکستان جناب غلام اسحاق خان نے بھی نہایت خوشی کا اظہار کیا اور ملک بھر میں اس کو صحیح سمت میں ایک اہم پیش رفت قرار دیا گیا ہے۔ شریعت بل کے مقاصد میں ایسے اقدامات کے لئے راہ کھولنا ہے جن کی مدد سے ملک کے نظام عدل، نظام معیشت، ذرائع ابلاغ اور نظام تعلیم کو اسلام کے مطابق تبدیل کیا جا سکے۔

شریعت بل میں جن میدانوں میں اصلاح تجویز کی گئی ہے، بلاشبہ یہی وہ شعبے ہیں جن میں عوام کی زندگیوں کو متاثر کرنے کی غیر معمولی صلاحیت موجود ہے اور پچھلے تینتالیس سالوں میں ان کی اصلاح کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا جا سکا۔ عدلیہ، عدل و قسط کے قیام کا ذمہ دار ادارہ ہے۔ معاشرتی انصاف کی کلید اسی کے پاس ہے لیکن رائج الوقت نظام عدل ایسا پیچیدہ اور سست رو ہے کہ لوگوں کو سالہا سال کی جد و جہد کے بعد بھی انصاف حاصل ہونے کی توقع نہیں ہوتی۔ ملکی معیشت سود خواروں کے چنگل میں ہے جنہوں نے خلق خدا کی روز مرہ زندگی کو اجیرن بنا رکھا ہے۔ ہر حکومت اس نظام معیشت کی اس قدر وفادار ہے کہ ہر آنے والا سال پہلے کی نسبت قرضوں کے بوجھ میں اضافہ کر دیتا ہے لیکن مجال ہے کہ حکمرانوں کے دلوں میں اس سے کوئی تکدر پیدا ہوتا ہو۔ ہمارے ذرائع ابلاغ آج لامذہبیت کا درس دے رہے ہیں اور اہم قومی مسائل کے حل کے لئے فضا ہموار کرنے کی بجائے وہ عوام کو تھپک کر سلا دینے کی پالیسی پر عمل کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قومی و ملی مقاصد ان کے مقاصد ہیں ہی نہیں۔ تعلیم کا فرسودہ نظام پہلے بھی بے فیض تھا، اب تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاق و کردار سے بچوں کو روشناس کرانے میں بالکل ہی ناکام ہو چکا ہے۔

سینیٹ کابل کو منظور کرنا اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ سینیٹ تمام صوبوں کا یکساں نمائندہ ادارہ ہے لہٰذا قومی اسمبلی میں جب یہ بل پیش ہو گا تو اس میں مین میکھ نکالنے کی سعی تو یقیناً کی جائے گی لیکن اس کی آواز کو یکسر دبانا مشکل ہو گا۔

اس وقت جو قومی اسمبلی اس بل پر غور کرے گی' اس میں ایسے لوگوں کی اکثریت ہے جو روشن خیال' مذہبی تقاضوں کو دقیانوسیت قرار دینے والے اور مغربی تہذیب کے دلدادہ ہیں۔ اس اسمبلی کی یہ شہرت بھی ہے

کہ اس نے ڈیڑھ برس کی مدت بغیر کوئی قانون بنائے گزار لی ہے۔ اس لئے شریعت بل کی منظوری کو تعویق میں ڈالے جانے کا امکان ہے۔ اس کے لئے کیا شکل اختیار کی جائے گی اس کے بارے میں قیاس آرائی فی الحال مشکل ہے۔

ہماری دستوری تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ حکومتوں نے کبھی بھی خوش دلی کے ساتھ شریعت کی عمل داری کو قبول نہیں کیا۔ جب بھی کوئی بات مانی ہے تو مارے باندھے ہی مانی ہے۔ شریعت کا نام آتے ہی ارکان حکومت کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنا دور حکومت نظام شریعت کی کڑوی گولی نگلے بغیر گزارنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ جس طرح ایک پٹڑی سے دوسری پٹڑی پر گاڑی کو لانے کے لئے کانٹا بدلنے کا اہتمام ناگزیر ہوتا ہے اسی طرح انگریزوں سے ورثہ میں ملے ہوئے نظام کو اسلامی نظام سے بدلنے کے لئے بھی منصوبہ بندی' ضروری قانون سازی اور اہتمام کی ضرورت ہے لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ اس منصوبہ بندی کی کوئی مخلصانہ کوشش حکومتی سطح پر نہیں ہوتی۔ ارباب اقتدار کا زاویہ نگاہ ہی ایسا ہے کہ وہ دین کے ہر معاملے کو تاخیر و تعویق کی نذر کرنا چاہتے ہیں۔ موجودہ شریعت بل بھی ایک نجی کوشش ہے' حکومت وقت نے اس کے ساتھ سرد مہری ہی کا معاملہ کیا ہے۔

شریعت بل کا اتفاق رائے سے منظور ہونا ایک لائق تحسین معاملہ ہے۔ ایوان سے باہر جو ایک آواز اس کے خلاف اٹھی وہ تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کی تھی۔ ان کے خیال میں ۱۹۷۳ء کا دستور شریعت کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ ایک اور بل کی منظوری نفاذ شریعت کے معاملے کو پیچیدہ بنا دے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ تحریک کو ہر اس اقدام سے کد اور نفرت ہے جس سے شریعت کی ترویج کی راہ کھلتی ہو۔ زکوٰۃ وعشر کے نفاذ کے موقع پر اس تحریک نے جو کردار ادا کیا وہ اس بات کی علامت ہے کہ آئندہ بھی وہ اسلامی نظام کی راہ میں روڑے اٹکانے کا باعث ہو گی اور ہمیں اگر اس نظام کی برکات میں سے کچھ حصہ حاصل ہونے کی توقع ہے تو وہ اس تحریک کے علی الرغم ہی حاصل ہو گا۔ امت کے سواد اعظم پر یہ حقیقت عیاں رہنی چاہئے۔

تدبرِ قرآن

خالد مسعود

تفسیر سورۂ اعراف (۲)

اور دوزخ والے جنت والوں کو آواز دیں گے کہ پانی یا ان چیزوں میں سے' جو اللہ نے تمہیں بخش رکھی ہیں' کچھ ہم پر بھی کرم فرماؤ۔ وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے یہ دونوں چیزیں کافروں کے لئے حرام کر رکھی ہیں ○ ان کے لئے جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنایا اور جن کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا[۳۶]۔ پس ہم ان کو نظر انداز کریں گے جس طرح انہوں نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلائے رکھا اور جیسا کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے ○ اور ہم نے ان کو ایک ایسی کتاب پہنچا دی ہے جس کی تفصیل ہم نے علم قطعی کی بنیاد پر کی ہے[۳۷]' ہدایت و رحمت بنا کر ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائیں ○ یہ لوگ بس اس کی حقیقت کے مشاہدے کے منتظر ہیں[۳۸]۔ جس روز اس کی حقیقت سامنے آئے گی' وہ لوگ جنہوں نے اس کو پہلے نظر انداز کیے رکھا'

---

۳۶ یہ آیت بھی بطور تضمین ہے جس سے کلام بالکل مطابق حال ہو گیا ہے۔ گویا یہ کفار قریش ہیں جنہوں نے دین کو ہنسی مسخری میں اڑایا حالانکہ دین اس لئے آتا ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو میں صحیح نقطہ نظر متعین کرے تاکہ لوگ ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے بجائے فلاح و سعادت کی راہ اختیار کریں۔ ان کے اس لاابالیانہ طرز عمل کا سبب یہ بنا کہ وہ عیش و تنعم میں پڑ کر زندگی کی نہایت سنجیدہ حقیقتوں سے اندھے بنے رہے۔

۳۷ یہ قرآن مجید کی طرف اشارہ ہے۔ اس کی صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ اس میں ہم نے اپنے علم قطعی کی روشنی میں ان تمام امور کی تفصیل بیان کر دی ہے جن سے آگاہ ہونا دنیا و آخرت کی سعادت کے لئے ضروری ہے۔

۳۸ مطلب یہ ہے کہ ساری باتیں جو قرآن سنا رہا ہے' ہیں تو اٹل حقیقتیں لیکن چونکہ ابھی یہ مستقبل کے پردے میں چھپی ہوئی ہیں اس وجہ سے منکرین ان کو خالی خولی دھمکی سمجھتے ہیں اور منتظر ہیں کہ یہ واقعات کی شکل میں ظاہر ہوں۔

بول اٹھیں گے کہ بے شک ہمارے رب کے رسول بالکل سچی بات لے کر آئے تھے 'تو ہیں کوئی ہمارے سفارشی کہ ہماری سفارش کریں یا ہے کوئی صورت کہ ہم دوبارہ لوٹائے جائیں کہ اس سے مختلف عمل کریں جو پہلے کرتے رہے ہیں- انہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور جو کچھ وہ گھڑتے رہے تھے سب ہوا ہو گئے ○

بے شک تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا 'پھر وہ عرش پر متمکن ہوا[۳۹]- ڈھانکتا ہے رات کو دن پر جو اس کا پوری سرگرمی سے تعاقب کرتی ہے اور اس نے سورج اور چاند اور ستارے پیدا کئے جو اس کے حکم سے مسخر ہیں- آگاہ کہ خلق اور امر اسی کے لئے خاص ہے[۴۰]- بڑا ہی بابرکت ہے اللہ 'عالم کا رب ○ اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے 'بے شک وہ حدود سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ○ اور ملک میں اس کی اصلاح کے بعد فساد برپا نہ کرو اور اسی کو پکارو بیم و رجا دونوں حالتوں میں- بے شک اللہ کی رحمت نیکو کاروں سے قریب ہے ○ ۵۶

اور وہی ہے جو اپنے ابر رحمت سے پہلے ہواؤں کو بشارت بنا کر بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب وہ بوجھل بادل کو اٹھا لیتی ہیں ہم اس کو ہانکتے ہیں کسی بے آب و گیاہ زمین کی طرف اور وہاں پانی برساتے ہیں اور پھر ہم اس سے پیدا کرتے ہیں ہر قسم کے پھل- اسی طرح ہم مردوں کو اٹھا کھڑا کریں گے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو ○ اور زرخیز زمین کی پیداوار تو خوب اپجتی ہے اس کے رب کے حکم سے 'پر جو زمین ناقص ہوتی ہے اس کی پیداوار کم ہی ہوتی ہے[۴۱]- اسی طرح ہم اپنی آیات مختلف پہلوؤں سے دکھاتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو شکر گذار بننا چاہیں ○ ۵۸

---

۳۹ شرک کی بے حقیقتی اور بدانجامی واضح کرنے کے بعد اب توحید کے مضمون سے بات کو مکمل کر دیا ہے- اہل عرب آسمان و زمین اور تمام دوسری چیزوں کا خالق تو اللہ ہی کو مانتے تھے لیکن ان کا تصور یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے انتظام و انصرام کے مختلف شعبے اپنے کارندوں میں تقسیم کر رکھے ہیں- اور اب ان شعبوں کے اصلی کرتا دھرتا وہی ہیں اس وجہ سے ان کی عبادت ضروری ہے- یہاں ان کو اس گمراہی پر ٹوکا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ کائنات کے جملہ امور و معاملات کا انتظام خدا کے پاس ہے-

۴۰ یعنی جس نے یہ کائنات خلق کی ہے اسی کا امر و حکم اس کے گوشہ گوشہ میں جاری ہے اور یہ حق بھی اسی کا تھا-

۴۱ یہاں بارش کی تمثیل سے بیک وقت تین حقیقتیں واضح فرمائی ہیں :

ایک یہ کہ خدا کی رحمت اس کے نیکو کاروں سے بہت قریب ہے 'اس کو دور سمجھ کر غیر اللہ کا سہارا نہیں پکڑنا چاہئے بلکہ امید و بیم ہر حال میں خدا ہی کی طرف رجوع کرنا چاہئے- دوسری یہ کہ جس طرح بارش کا ایک چھینٹا پڑنے سے بنجر زمین کے ہر گوشے میں زندگی نمودار ہو جاتی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ جب چاہے گا انسانوں کے مر کھپ جانے کے بعد ان کو از سر نو زندہ اٹھا کھڑا کرے گا- تیسری یہ کہ جس طرح بارش کا اثر مختلف صلاحیت کی زمینوں پر مختلف شکلوں میں نمایاں ہوتا ہے اسی طرح قرآن کی شکل میں ہدایت و رحمت کی جو بارش نازل ہو رہی ہے اس سے بھی مختلف صلاحیت کی طبیعتیں مختلف اثر لیں گی-

ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا[۴۲]- اس نے ان کو دعوت دی کہ اے میرے ہم قومو 'اللہ ہی کی بندگی کرو 'اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں- میں تم پر ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں[۴۳] ○ اس کی قوم کے بڑوں نے جواب دیا کہ ہم تو تم کو ایک کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا دیکھ رہے ہیں ○ اس نے کہا- اے میرے ہم قومو 'مجھ میں کوئی گمراہی نہیں بلکہ میں تمام عالم کے رب کا رسول ہوں ○ تمہیں اپنے رب کے پیغام پہنچا رہا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کر رہا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ○ کیا تمہیں یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی یاددہانی تمہی میں سے ایک شخص کے ذریعہ سے آئی تاکہ وہ تمہیں باخبر کرے اور تاکہ تم ڈرو اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے ○ پس ان لوگوں نے اس کو جھٹلا دیا تو ہم نے اس کو اور جو لوگ کشتی میں اس کے ساتھ تھے ان کو نجات دی اور ان لوگوں کو غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی[۴۴]- بے شک یہ لوگ اندھے تھے ○ ۶۴

---

۴۲ آگے کی آیات میں اوپر کا انذار کا مضمون تاریخی دلائل سے واضح کیا گیا ہے- ثابت یہ کرنا مقصود ہے کہ خدا جب کسی قوم میں اپنا رسول بھیج دیتا ہے تو اس قوم کے لئے دو ہی باتیں باقی رہ جاتی ہیں- یا تو وہ اصلاح قبول کرلے یا ہلاکت- اس کے سوا کوئی راہ باقی نہیں رہ جاتی- اب قریش کا معاملہ بھی اسی عدالت میں ہے جس میں پچھلی قوموں کے مقدمے پیش ہو کر فیصل ہوئے اور وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچیں-

۴۳ ہولناک دن سے مراد دنیوی عذاب کا دن ہے- اللہ کے رسول اپنی اپنی قوموں کو دو عذابوں سے ڈراتے رہے ہیں- ایک اس عذاب سے جو رسول کی تکذیب کے لازمی نتیجہ کے طور پر دنیا میں آجاتا ہے اور دوسرے اس عذاب سے جس سے جزا و سزا کے فیصلہ کے دن آخرت میں دوچار ہونا پڑے گا- یہاں عذاب دنیا کی طرف اشارہ ہے-

۴۴ کسی قوم پر قحط 'وبا 'زلزلہ 'طوفان وغیرہ کی قسم کے ابتلائی مصائب جب نازل ہوتے ہیں تو ان میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ان کی آفت صرف مجرموں ہی تک محدود رہے بلکہ اچھے برے سب ان کی لپیٹ میں آتے ہیں- لیکن اللہ تعالیٰ جب کسی قوم پر اتمام حجت کے بعد اس کے اعمال کی پاداش میں کوئی فیصلہ کن عذاب بھیجتا ہے تو اس کی نوعیت ابتلائی مصائب سے مختلف ہوتی ہے- اس صورت میں عذاب کی زد سے وہ لوگ بچا لئے جاتے ہیں جو اصلاح کرنے والے یا اصلاح کرنے والوں کے پیرو ہوتے ہیں- تکذیب کرنے والے اس سے

اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا[45]- اس نے دعوت دی، اے میرے ہم قومو! اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی اور معبود نہیں، تو کیا تم ڈرتے نہیں ○ اس کی قوم کے بڑوں نے، جنہوں نے کفر کیا، جواب دیا کہ ہم تو تم کو ایک کھلی ہوئی حماقت میں مبتلا دیکھتے ہیں[46] اور ہم تم کو جھوٹوں میں سے گمان کرتے ہیں ○ اس نے کہا اے میرے ہم قومو! مجھ میں کوئی حماقت نہیں ہے بلکہ میں خداوند عالم کا رسول ہوں ○ تمہیں اپنے رب کا پیام پہنچا رہا ہوں اور تمہارا دیانت دار ناصح ہوں ○ کیا تمہیں یہ بات عجیب لگی کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی یاد دہانی تمہی میں سے ایک شخص کے واسطے سے پہنچی تاکہ وہ تمہیں ہوشیار کرے- اور یاد کرو جب اس نے تمہیں قوم نوح کے بعد ان کا جانشین بنایا اور جسمانی اعتبار سے تمہیں وسعت و کشادگی عطا فرمائی تو اللہ کی شانوں کو یاد رکھو تاکہ تم فلاح پاؤ[47] ○ وہ بولے کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ ہم تنہا اللہ ہی کی عبادت کریں اور ان کو چھوڑ بیٹھیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے- تو تم جس عذاب کی ہم کو دھمکی سنا رہے ہو اس کو لاؤ اگر تم سچے ہو ○ اس نے کہا تم پر تمہارے رب کی جانب سے ناپاکی اور قہر مسلط ہو چکے ہیں[48]- کیا تم مجھ سے کچھ فرضی ناموں کے بارے میں جھگڑ رہے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ چھوڑے ہیں- جن کی خدا نے کوئی دلیل نہیں اتاری[49]- سو تم بھی انتظار کرو، میں بھی

نہیں بچ سکتے-

۴۵ عاد عرب کی قدیم اقوام میں سے ہیں- ان کا تعلق سامی نسل سے ہے- طوفان نوح کے بعد جو لوگ باقی بچے ان میں سے بعض نے دجلہ و فرات کے دو آبے سے عرب کی طرف ہجرت کی اور احقاف کے علاقہ میں آباد ہو گئے- یہی عاد تھے جنہوں نے رفتہ رفتہ بڑی قوت و شوکت حاصل کر لی-

۴۶ یعنی تم ہم کو قہر و عذاب سے ڈراتے ہو تو یہ محض تمہاری خرد باختگی ہے- ہماری یہ ترقیاں ہمارے مستحق عذاب ہونے کی علامت ہیں یا منظور نظر اور صراط مستقیم پر گامزن ہونے کی-

۴۷ مطلب یہ ہے کہ تم کو خدا نے جسمانی اور عقلی دونوں اعتبار سے تفوق و برتری عطا فرمائی اور بے شمار صلاحیتوں سے نوازا- ان کی قدر کرو، ان کے سبب سے فتنے میں نہ پڑو- خدائی شانوں اور عظمتوں کو یاد رکھو- یہی راستہ فلاح کا راستہ ہے-

۴۸ ناپاکی سے مراد کفر و شرک اور اعمال و عقائد کی گندگی و ناپاکی ہے- اس سے خدا کا غضب بھڑکتا اور اس کا قہر نازل ہوتا ہے- مطلب یہ ہے کہ ناپاکی کا اتنا انبار جمع کر لینے کے بعد تم خدا کے عذاب کے مستحق تو ہو چکے ہو- اب صرف اس کا انتظار باقی رہ گیا ہے-

۴۹ یعنی تمہاری یہ حجت بالکل بے بنیاد ہے- تم جن اصنام خیالی کو پوجتے ہو ان کے شریک خدا ہونے کی کوئی

تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں ○ پس ہم نے اس کو اور ان کو جو اس کے ساتھ تھے اپنے فضل سے نجات دی اور ان لوگوں کی ہم نے جڑ کاٹ دی جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور یہ ایمان لانے والے لوگ نہیں تھے[50] ○ ۷۲

اور ثمود کی طرف[51] ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا- اس نے دعوت دی، اے میرے ہم قومو! اللہ ہی کی بندگی کرو- اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں- تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے ایک واضح نشانی آ گئی ہے- یہ اللہ کی اونٹنی ہے کہ تمہارے لئے ایک نشانی ہو پس اس کو چھوڑ دو کہ یہ اللہ کی زمین میں چرے پھرے- اور اس کو کوئی گزند نہ پہنچاؤ ورنہ تمہیں ایک دردناک عذاب[52] آ پکڑے گا ○ اور یاد کرو جب کہ خدا نے قوم عاد کے بعد تم کو ان کا جانشین بنایا اور ملک میں تم کو تمکن بخشا، تم اس کے میدانوں میں محل تعمیر کرتے اور پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو تو اللہ کی شانوں کو یاد کرو اور ملک میں اودھم مچاتے نہ پھرو[53] ○ اس کی قوم کے ان بڑوں نے جنہوں نے گھمنڈ کیا، ان زیردستوں سے کہا جو ان میں سے ایمان لائے، کیا تم سمجھتے

دلیل نہ عقل و فطرت کے اندر موجود ہے نہ خدا نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے اس کی کہیں خبر دی ہے- اس کے برعکس جہاں تک خدا کا تعلق ہے وہ نزاعی چیز نہیں ہے- اس کی دلیل تمہارے پاس موجود ہے اور تم اس کو مانتے بھی ہو-

۵۰ فیصلہ کن عذاب اس وقت نازل ہوتا ہے جب رسول کی مخاطب قوم اپنی ہٹ اور ضد سے یہ ثابت کر دیتی ہے کہ اس کے اندر صلاحیت ایمان کی کوئی رمق باقی نہیں رہی ہے-

۵۱ قوم عاد کی تباہی کے وقت جو لوگ عذاب سے محفوظ رہے، انہوں نے عرب کے شمال مغرب کی طرف ہجرت کر لی اور پھر حجر میں سکونت اختیار کر لی- یہ ثمود تھے-

۵۲ حضرت صالح کی دعوت کے جواب میں قوم نے ان سے عذاب کا مطالبہ کر دیا جس کے جواب میں انہوں نے ایک اونٹنی نامزد کر دی اور فرمایا کہ اس سے کوئی تعرض نہ کرے، یہ امان کی دیوار ہے، اگر اس کو کوئی گزند پہنچایا گیا تو وہ عذاب ٹوٹ پڑے گا جس سے میں آگاہ کر رہا ہوں- قرآن کے الفاظ سے یہ بات نہیں نکلتی کہ یہ اونٹنی اپنی خلقت کی اعجوبگی کے لحاظ سے کوئی نشانی تھی-

۵۳ ثمود نے تمدنی اور تعمیری اعتبار سے اپنے زمانے میں بڑی ترقی کی- ان کے بعض تعمیری آثار آج بھی موجود ہیں اور فن تعمیر میں ان کے کمال کی شہادت دیتے ہیں- حضرت صالح نے ان کو یاد دلایا کہ خدا کی عظیم قدرتوں کو یاد کرو اور خدا کی زمین میں مفسد بن کر سر نہ اٹھاؤ-

ہو کہ صالح اپنے رب کا فرستادہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم تو اس پیام پر جو وہ دے کر بھیجے گئے ہیں ایمان رکھتے ہیں ○ مستکبرین نے کہا کہ ہم تو اس چیز کے منکر ہیں جس پر تم ایمان لائے ہو[۵۴]- تو انہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی اور بولے کہ اے صالح' اگر تم خدا کے فرستادہ ہو تو وہ عذاب ہم پر لاؤ جس کی دھمکی دے رہے ہو ○ پس ان کو کپکپی نے آ پکڑا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے ○ تو وہ ان کو چھوڑ کر یہ کہہ کر چل دیا کہ اے میری قوم کے لوگو' میں نے تمہیں اپنے رب کا پیام پہنچا دیا اور تمہاری خیر خواہی کر دی لیکن تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے[۵۵] ○ ۷۹

اور ہم نے لوط کو بھیجا- جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم کھلی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو! تم سے پہلے دنیا کے کسی نے بھی اس کا ارتکاب نہیں کیا ○ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو- بڑی ہی اوندھی عقل کے بلکہ حد سے گذر جانے والے لوگ ہو[۵۶] ○ اس پر اس کی قوم والوں نے جواب دیا تو یہ دیا کہ ان کو اپنی بستی سے نکالو' یہ بڑے پارسا بنتے ہیں ○ تو ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو' اس کی بیوی کے سوا جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی[۵۷]' نجات دی ○ اور ان پر اچھی طرح پتھراؤ کر دیا- تو

---

۵۴ انبیا کی دعوت قبول کرنے میں ہمیشہ غریبوں اور کمزوروں ہی نے سبقت کی ہے اس لئے کہ وہ تکبر سے پاک ہوتے ہیں اور تکبر وہ چیز ہے جو قبول حق میں سب سے بڑا مانع ہے-

۵۵ یہ قوم سے حضرت صالح کا آخری خطاب ہے جس کے بعد انہوں نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس علاقے سے ہجرت فرمائی- اس میں انہوں نے اس حقیقت کا بیان فرمایا ہے کہ قومی مزاج کے بگاڑ کا ایک مرحلہ وہ بھی ہوتا ہے جب تمام اخلاقی پیمانے اس طرح تلپٹ اور تمام اقدار اس درجہ متغیر ہو جاتی ہیں کہ قوم خیر خواہوں کو اپنا دشمن سمجھنے لگتی ہے اور جو لوگ عذاب الٰہی کے بند کو توڑتے ہیں وہ قوم کے ہیرو بن جاتے ہیں- قومی فساد مزاج کی یہی وہ حد ہے جہاں پہنچ کر قوم لازماً تباہی سے دوچار ہوتی ہے-

۵۶ قوم لوط میں مردوں کا مردوں ہی کو شہوت رانی کا محل بنانا سوسائٹی میں ایک فیشن کی حیثیت اختیار کر گیا تھا- حضرت لوط نے اس پر اظہار نفرت فرمایا کہ ایسی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو جس کا بے حیائی ہونا ہر عقل سلیم پر واضح ہے' پھر یہ اتنی بری حرکت ہے جو تم سے پہلے کسی قوم نے نہیں کی' پہلے کوئی شامت زدہ سوسائٹی ایسی نہیں گذری جس نے اس غلاظت کو تمہاری طرح اوڑھنا بچھونا بنایا ہو' تم نے تو فطرت کو بالکل ہی الٹ کر رکھ دیا ہے-

۵۷ حضرت لوط کی بیوی کا تعلق اسی ناہنجار قوم سے تھا- قوم کی عصبیت کے باعث اس نے قوم کا ساتھ دیا اور

دیکھو مجرموں کا کیا انجام ہوا ○ ۸۴

اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا- اس نے دعوت دی' اے میرے ہم قومو' اللہ ہی کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں- تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح حجت آ چکی ہے تو ناپ تول پوری کرو' لوگوں کی چیزوں میں کوئی کمی نہ کرو اور زمین میں' اس کی اصلاح کے بعد' فساد برپا نہ کرو- یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو[۵۸] ○ اور ہر راہ میں دھمکیاں دیتے' اہل ایمان کو اللہ کی راہ سے روکتے اور اس راہ کو کج کرتے نہ بیٹھو[۵۹]- یاد کرو جب کہ تم میں سے ایک گروہ اس چیز پر ایمان لایا ہے جو میں دے کر بھیجا گیا ہوں اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا ہے تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ فرما دے[۶۰] اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ○ اور اس کی قوم کے بڑوں نے جنہوں نے تکبر کیا' کہا کہ اے شعیب' ہم تم کو اور جو تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں ان کو اپنی بستی سے نکال کر رہیں گے یا تم ہماری ملت میں پھر آ جاؤ- اس نے کہا کیا جب ہم اس سے نفرت کرتے ہوں تب بھی ○ ہم اللہ پر جھوٹ تہمت باندھنے والے ٹھہریں گے اگر ہم تمہاری ملت میں لوٹ آئیں بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں اس سے نجات دی- یہ ہم سے تو ہونے کا نہیں کہ ہم اس ملت میں لوٹ آئیں مگر یہ کہ اللہ ہمارے رب ہی کی مشیت ہو تو اور بات ہے[۶۱]- ہمارے رب کا علم ہر شے کو محیط ہے- ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا- اے ہمارے رب'

وہ انہی کے انجام سے دوچار ہوئی-

۵۸ مدین کے لوگ بحر احمر کے ساحل پر ایک اہم تجارتی گذرگاہ پر آباد تھے اس وجہ سے انہوں نے تجارت میں بہت ترقی کی- پھر ان کے اندر عقائدی خرابیوں کے ساتھ ساتھ وہ برائیاں بھی پیدا ہو گئیں جو تجارت پیشہ قوموں میں پیدا ہو جایا کرتی ہیں- حضرت شعیب نے انہی برائیوں سے منع کیا اور واضح کیا کہ ناپ تول کی کمی عدل و قسط کے انکار پر مبنی اور قوم کے پورے نظام معاشرت و معیشت کو درہم برہم کر دینے کے ہم معنی ہے-

۵۹ یہ قوم کے سرکشوں کی ان سرگرمیوں کی طرف اشارہ ہے جو وہ حضرت شعیب کے ساتھیوں کو ہراساں کرنے اور ایمان کی راہ سے ہٹانے کے لئے اختیار کرتے تھے-

۶۰ مطلب یہ ہے کہ قوم کے اندر سے ایک گروہ کا ایمان لانا اس بات کا قرینہ ہے کہ قوم کے اندر اصلاح قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہے- اس صورت میں سنت الٰہی یہ ہے کہ وہ قوم کو مہلت دیتا ہے کہ نبی اور صالحین اپنی پوری قوم کو چھاج میں پھٹک کر صالح عنصر علیحدہ کر لیں- اس عمل کے پورا ہونے کے بعد وہ قوم کا فیصلہ فرماتا ہے-

۶۱ اس ارشاد کا مدعا یہ ہے کہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے اب تمہاری ملت میں واپس آنے کا کوئی امکان نہیں-

ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دے -تو بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے[۶۲] ○ اور ان بڑوں نے جنھوں نے اس کی قوم میں سے کفر کیا' کہا کہ اگر تم شعیب کی پیروی کرو گے تو بڑے خسارے میں پڑو گے ○ تو ان کو کپکپی نے آ پکڑا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے ○ جنھوں نے شعیب کی تکذیب کی گویا کبھی اس بستی میں بسے ہی نہیں 'جنھوں نے شعیب کو جھٹلایا وہی نامراد ہوئے[۶۳] ○ تو وہ ان کو یہ کہہ کر چھوڑ کر چل دیا کہ میرے ہم قوموں میں نے تمہیں اپنے رب کے پیغام پہنچا دیئے اور تمہاری خیر خواہی کر دی تو اب میں کفر کرنے والوں کا غم کیوں کروں[۶۴] ○ ۹۳

لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت ہر چیز پر غالب ہے -اس کی آزمائشوں میں کامیاب ہونا اسی کی توفیق پر منحصر ہے -یہ صرف اسی کو علم ہے کہ کس کے لئے کیا مقدر ہے - گویا اس فقرے میں اپنے عزم کا اظہار بھی ہے اور تفویض الی اللہ بھی -یہی عزم اور تفویض توحید کی حقیقت ہے -

۶۲ یہ وہ دعا ہے جو رسول اپنی قوم کی اصلاح سے مایوس ہو کر کرتا ہے -اس طرح کی دعائیں حضرت نوح' حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہم السلام نے بھی کیں اور قرآن مجید میں نقل ہوئی ہیں -

۶۳ یہ قوم کی ان دھمکیوں کی طرف تلمیح ہے جن میں انھوں نے یہ کہا تھا کہ ہم تم کو اپنی بستیوں سے نکال باہر کریں گے اور تم ہی خسارے میں رہو گے -

۶۴ مطلب یہ ہے کہ میں نے تمہیں خدا کا پیغام پہنچا دیا اور تمہاری خیر خواہی میں اپنے دن رات ایک کر دیے -اس سب کے باوجود بھی اگر تم اپنا بیڑا غرق کرنے پر تلے بیٹھے ہو تو اب میرے لئے تمہارے اس انجام پر ترس کھانے کا کیا موقع باقی رہا !

خالد مسعود

اسالیبِ قرآن

التفات

قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہوئے لوگ یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ اس میں مضمون کی اس طرح کی بندش پائیں گے جو نثری مضامین کا خاصہ ہوتی ہے یعنی یہ کہ پہلے موضوع کا تعارف کرایا جائے گا' پھر اس کو زیر بحث لایا جائے گا' اس سے متعلق ضروری دلائل فراہم کئے جائیں گے اور آخر میں بحث کو سمیٹا جائے گا - لیکن جب وہ کسی سورہ کو پڑھنا شروع کرتے ہیں تو کلام میں اس طرح کی کوئی خصوصیت نظر نہیں آتی بلکہ وہ دیکھتے ہیں کہ قرآن میں کلام کا رخ ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے -ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب تھے کہ اگلی ہی آیت میں خطاب مومنین کے ساتھ ہو گیا -ابھی مشرکین یا اہل کتاب مخاطب تھے کہ چند ہی آیات کے بعد مسلمانوں کے کسی طبقے سے کلام شروع ہو گیا -یہ انداز نثری مضامین میں اختیار نہیں کیا جاتا -یہ اگر ملتا تو خطیبوں کے ہاں ملتا ہے -یہ عربی ادب اور قرآن مجید کا ایک اسلوب ہے جس کو التفات کا نام دیا جاتا ہے -

قرآن مجید کی حیثیت پر غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ یہ ایک آسمانی خطیب ہے جو روئے زمین کے تمام انسانوں کو خطاب کر رہا ہے -خطیب کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جب اپنا مدعا بیان کرتا ہے تو اپنے سامعین کو پیش نظر رکھتا ہے -چونکہ سامعین میں مختلف مزاج و استعداد اور سوچ رکھنے والے لوگ شامل ہوتے ہیں اس لئے وہ ہر ایک کے نقطہ نظر کو سامنے رکھ کر بات کرتا ہے -وہ کبھی دائیں جانب مڑتا ہے کبھی بائیں جانب' کبھی قریب والوں سے ہم کلام ہوتا ہے کبھی دور والوں کو مخاطب کرتا ہے تاکہ تمام سامعین کے ساتھ اس کا رابطہ رہے ہر گروہ سے خطاب کرتے ہوئے اس کا لہجہ بدلتا ہے اور اس کا پیغام ہر کے لئے الگ ہوتا ہے - قرآن مجید ایک ایسا آسمانی خطیب ہے جس کے پیش نظر دنیا بھر کے انسانوں کی اصلاح ہے -اس نے حق کو واضح کرنا ہے' اس کے بارے میں انسانوں کے جس طبقے میں بھی کوئی غلط فہمی پائی جاتی ہے اس کو رفع کرنا ہے اور ان کے

روپوں پر نکتہ چینی کرنی ہے اس لئے قرآن مجید کے لئے خطیبانہ اسلوب ہی موزوں تھا اور التفات اسی اسلوب کا مظہر ہے۔

جن لوگوں سے التفات کے اسلوب کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے انہوں نے قرآن مجید کو بے ربطی کا الزام دیا۔ اس الزام کو مغربی دانشوروں نے خوب اچھالا۔ انہوں نے قرآن کی نام نہاد بے ربطی کو اس کے "مولفین" کی کم علمی اور بے سلیقگی کا نتیجہ سمجھا اور اپنے زعم میں اس کی اصلاح کی تدبیریں کیں۔ نولڈیکی، ہوبرٹ گریم، داؤد، میوئر اور راڈویل نے اپنے اپنے فہم کے مطابق قرآن کی سورتوں کی ترتیب بدل کر یہ مقصد حاصل کرنا چاہا اور محرف نسخے شائع کئے۔

اس کے بعد رچرڈ بیل نے سورتوں کی قطع برید شروع کی۔ اپنے زعم میں اس نے "غیر مربوط" آیات کو دوسری "موزوں" سورتوں میں جگہ دی اور اس طرح قرآن کا ایک ایسا نسخہ تیار کیا جو اس کی دانست میں زیادہ مربوط اور ایڈیٹنگ کا اچھا نمونہ تھا لیکن پہلی کوششوں کی طرح تحریف قرآن کی یہ نئی کوشش خود مستشرقین کی نگاہوں میں بھی کوئی وقعت نہ پا سکی اور قرآن کی یہ "خدمت" لاحاصل رہی۔ ہمارے نزدیک محرفین کی مذکورہ کوششیں بڑی حد تک التفات کے اسلوب سے ناواقفیت کا شاخسانہ ہیں حالانکہ یہ اسلوب قرآن ہی کا نہیں عربی ادب کا اسلوب ہے اور اس کی مثالیں عرب خطباء کے کلام اور کعب بن زہیر، اعشیٰ اور دوسرے شعراء کے قصیدوں میں ملتی ہیں۔

اہل بلاغت کے ہاں التفات کا تصور

اہل بلاغت عموماً جس چیز کو التفات میں شمار کرتے ہیں وہ ضمیروں کا وہ انتشار ہے جس کے تحت کلام متکلم سے مخاطب، مخاطب سے غائب اور غائب سے متکلم یا مخاطب کی طرف برابر بدلتا رہتا ہے۔ اس کو چند مثالوں سے سمجھنا مناسب ہو گا۔

۱۔ إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ○ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ (فتح ۱-۲)

بے شک ہم نے تم کو ایک کھلی ہوئی فتح عطا فرمائی کہ اللہ تمہارے تمام اگلے اور پچھلے گناہوں کو بخشے۔

یہاں آیت کا آغاز ضمیر متکلم سے ہوا لیکن آگے لنغفر لک کہنے کے بجائے ضمیر غائب استعمال کر دی گئی تا کہ مغفرت کو ذات باری تعالیٰ کی صفات سے وابستہ کر دیا جائے۔

۲۔ إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ ○ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ○ (کوثر ۱-۲)

ہم نے تم کو بخشا کوثر، تو اپنے خداوند ہی کی نماز پڑھو اور اسی کے لئے قربانی کرو۔

یہاں کلام کا ظاہری تقاضا یہ تھا کہ پہلی آیت کی ضمیر متکلم کے ساتھ ہم آہنگی کے لئے فصل لنا کہا جاتا لیکن لربک کے الفاظ استعمال کر دیئے گئے تا کہ رب کی ربوبیت کا حق واضح ہو جائے۔

۳۔ وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا ۚ وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا (فصلت ۱۲)

اور اس نے ہر آسمان میں اس کے متعلق فرائض وحی کر دیئے اور ہم نے آسمان زیریں کو چراغوں سے سنوارا۔

یہاں کلام کا آغاز ضمیر غائب سے ہوا لیکن آگے ضمیر متکلم استعمال کی کیونکہ افضال و عنایات اور اہتمام کے ذکر کے لئے یہی صیغہ موزوں تھا۔

۴۔ سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ○ (بنی اسرائیل ۱)

پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو لے گئی ایک شب مسجد حرام سے اس دور والی مسجد تک جس کے اردگرد کو ہم نے برکت بخشی تا کہ ہم اس کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بے شک سمیع و بصیر وہی ہے۔

یہاں آیت کے آغاز اور اختتام پر ضمیر غائب استعمال ہوئی ہے جب کہ وسط میں ضمیر متکلم۔

اہل بلاغت کے نزدیک بات اگر ایک ہی انداز میں کہی جاری ہو تو سامع اس سے اکتا جاتا ہے۔ التفات کا اسلوب یہ بیزاری پیدا نہیں ہونے دیتا۔ نیز ضمیریں بدل کر لانے میں کچھ اور باتیں بھی ملحوظ ہوتی ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کا کوئی حق اور اس کی صفات کا کوئی تقاضا بیان کرنا ہو تو اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف کرنا مناسب ہوتا ہے۔ اگر اس کی افضال و عنایات کا بیان ہو تو جمع متکلم کی ضمیر موزوں ہوتی ہے۔ غیظ و غضب کے اظہار کا موقع ہو تو کسی کو مخاطب کرنا بلیغ ہوتا ہے جب کہ نفرت کے اظہار کے لئے منہ پھیر کر بات کی جاتی ہے اور اس کے لئے غائب کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔

التفات کا جامع تصور

التفات کا یہ تصور جسے اہل بلاغت نے پیش نظر رکھا ہے نہایت محدود ہے- اس کا جامع تصور یہ ہے کہ اس اسلوب میں کلام کا رخ ایک گروہ سے دوسرے گروہ کی طرف مڑ جاتا ہے- قرآن مجید میں اس کے استعمال کی شان یہ ہے کہ یہ اسلوب آیات سے لے کر آیات کے مجموعوں تک اور پھر سورتوں تک پھیل گیا ہے- اس کی وضاحت آگے کے مباحث سے ہو جائے گی-

آیات میں التفات

۱- يُوسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هَٰذَا ۚ وَاسْتَغْفِرِي لِذَنبِكِ (یوسف ۲۹)

یوسف اس کو چھوڑو اور تو اے عورت اپنے گناہ کی معافی مانگ-

یہ عزیز مصر کا وہ کلام نقل ہوا ہے جس میں اس کے مخاطب حضرت یوسف علیہ السلام بھی تھے اور اس کی بیوی بھی- حضرت یوسف کو اس نے یہ ہدایت کی وہ اس صورت حال کو اہمیت نہ دیں جس سے وہ دوچار ہوئے اور اپنی بیوی کو خطا کار سمجھتے ہوئے اس نے تنبیہ کی کہ وہ اپنی غلطی پر شرمسار ہو اور معافی مانگے-

۲- قَالَ إِنَّ رَسُولَكُمُ الَّذِي أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ ۝ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ ۝ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ إِلَٰهًا غَيْرِي لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ ۝ (الشعراء ۲۷-۲۹)

فرعون نے کہا، تمہارا یہ رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے، بالکل خبطی ہے- موسیٰ نے کہا، مشرق ومغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب، اگر تم عقل رکھتے ہو- وہ بولا کہ اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو میں تمہیں قید کر کے رہوں گا-

ان آیات کا موقع وہ ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے دربار میں تقریر کرتے ہوئے رب کی صفات بیان کر رہے ہیں- فرعون اپنے درباریوں کی نگاہوں میں حضرت موسیٰ کو گرانے کے لئے یہ کہتا ہے کہ

یہ شخص دیوانہ معلوم ہوتا ہے، اس کی باتیں لائق توجہ نہیں- حضرت موسیٰ اس تبصرہ کے باوجود اپنی تقریر جاری رکھتے ہیں تو فرعون زچ ہو کر انہیں مخاطب کر کے کہتا ہے کہ مجھے الہٰ مانو ورنہ میں تمہیں قید کر دوں گا- خطاب کا رخ بدلنے ہی کا نام التفات ہے-

۳- إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ لِّتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ (فتح ۸-۹)

بے شک ہم نے تم کو گواہی دینے والا، خوشخبری پہنچانے والا اور آگاہ کر دینے والا بنا کر بھیجا ہے تاکہ لوگو تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ-

پہلی آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ ومقام واضح فرمایا ہے اور اس میں خطاب خود انہی سے ہے- دوسری آیت میں اس مرتبہ ومقام کے تقاضے سے مسلمانوں کو آپ کے حقوق یاد دلائے ہیں- اس میں خطاب اہل ایمان سے ہو گیا ہے-

۴- وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ رِجَالًا نُّوحِيٓ إِلَيْهِمْ ۚ فَسْـَٔلُوٓا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ بِالْبَيِّنَٰتِ وَالزُّبُرِ ۗ وَأَنزَلْنَآ إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ۝ (النحل ۴۳، ۴۴)

اور ہم نے تم سے پہلے بھی آدمیوں ہی کو دلائل اور کتابوں کے ساتھ رسول بنا کر بھیجا جن کی طرف ہم وحی کرتے رہے- تو لوگو، اہل علم سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے- اور ہم نے تم پر بھی یاد دہانی اتاری تاکہ لوگوں پر اس چیز کو اچھی طرح واضح کر دو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے اور تاکہ وہ غور کریں-

یہاں کلام کے پہلے اور آخری حصہ میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے- اس میں بتایا گیا ہے کہ تمام سابق انبیاء کی طرح آپ بھی بشر ہیں جن کی طرف وحی نازل کی جا رہی ہے- درمیان میں خطاب معترضین سے ہے کہ اگر تمہیں اس بات پر یقین نہیں آتا تو پہلے کے حاملین کتاب سے پوچھ دیکھو، وہ بھی بتائیں گے کہ ماضی میں نبی ہمیشہ بشر ہی آتے رہے ہیں- ان میں کوئی فرشتہ نہ تھا-

آیات کے مجموعوں میں التفات

التفات کے ایسے مواقع جن میں کئی کئی آیات کے مجموعے مختلف گروہوں کو مخاطب کرتے ہوں سورتوں میں اس قدر کثرت سے ہیں کہ ذرا سے غور کے بعد ایک قاری ان پر متنبہ ہو جاتا ہے۔ سورہ بقرہ ہی کو لیجئے اس میں یاایھا الناس' بنی اسرائیل اور یاایھا الذین امنوا سے آغاز کر کے مختلف گروہوں کو مخاطب کیا ہے اور ان کو الگ الگ تعلیم دی ہے۔ بیچ بیچ میں جہاں ضرورت کا تقاضا ہوا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مخاطب کیا گیا ہے۔ یہ سب التفات ہی کی مثالیں ہیں۔ تاہم اسلوب کو سمجھنے کے لئے چند ایسی آیات کی نشاندہی ضروری ہے جہاں مخاطب کی تبدیلی یک لخت واقع ہوئی ہے۔

۱ التفات کی نہایت قریب الفہم مثال سورہ فاتحہ میں ہے۔ اس میں ہم اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا اقرار کرتے ہیں لیکن اس کو مخاطب کر کے ان صفات کا حوالہ نہیں دیتے۔ اس کے بعد ایاک نعبد و ایاک نستعین سے اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے اس سے دعا کرتے ہیں۔ اس میں بلاغت یہ ہے کہ مدح کے مواقع پر غائب کا صیغہ موزوں سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس میں مخاطب کی تعظیم اور اس کے مرتبہ جلیلہ کا لحاظ زیادہ ہے لیکن دعا انابت اور اس کے سامنے اظہار عجز کا تقاضا کرتی ہے جس کے لئے حاضر کا صیغہ زیادہ موثر ہوتا ہے۔

۲ سورہ مزمل کی ابتدائی چودہ آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے ضروری ہدایات دی گئی ہیں جنہوں نے آپ کو فکر مند کر رکھا ہے' آپ کو قیام لیل' تلاوت قرآن' ذکر الٰہی اور توکل و استقامت کی تلقین کی گئی ہے۔ اس کے بعد آیات ۱۵ تا ۱۹ میں قریش کے لیڈروں کو مخاطب کر کے ان کو یہ تنبیہ کی ہے کہ ہمارے رسول کی تکذیب کرتے وقت اس انجام کو یاد رکھو جس سے حضرت موسیٰ کی نافرمانی کے باعث فرعون اور اس کی قوم کو دو چار ہونا پڑا تھا۔ آگے آیت ۲۰ میں پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان مخاطب ہیں۔

۳ سورہ ہود میں قوم نوح کی ہلاکت اور حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کی نجات کا واقعہ مفصل بیان ہوا ہے' اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (ہود ۴۹)

یہ ماجرا غیب کی باتوں میں سے ہے جو ہم تم کو وحی کے ذریعے سنا رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تم ہی اس کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم کے لوگ ہی۔

تو ثابت قدم رہو' انجام کار کی کامیابی خدا سے ڈرنے والوں ہی کا حصہ ہے۔

اسی طرح کے موقع کی دوسری مثالیں سورہ آل عمران میں آیت ۴۴ اور سورہ القصص آیات ۴۴ تا ۴۶ میں ہیں۔

۴ سورہ آل عمران کی آیات ۱۵۶ تا ۱۵۸ میں مسلمانوں کو نصیحت ہے کہ وہ کفار و منافقین کی روش کی تقلید سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔ ادائے فرض کی راہ میں مرنا اس دنیا کی زندگی کے تمام اندوختوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝ (آل عمران ۱۵۹)

یہ اللہ ہی کا فضل ہے کہ تم ان کے لئے نرم خو ہو۔ اگر تم درشت خو اور سخت دل ہوتے تو تمہارے پاس سے یہ منتشر ہو جاتے' سو ان سے درگزر کرو' ان کے لئے مغفرت چاہو اور معاملات پر ان سے مشورہ لیتے رہو۔ پس جب تم فیصلہ کرو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ بے شک اللہ اپنے اوپر بھروسہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہ آیت بطور التفات وارد ہوئی ہے۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کریمانہ طرز عمل کی تصویب ہے جو آپ نے منافقین کے ساتھ روا رکھا تھا اور آئندہ بھی اسی روش پر قائم رہنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

سورتوں میں التفات

قرآن مجید کی ترتیب میں غور کیا جائے تو ان میں بعض سورتیں ایسی نظر آتی ہیں جو التفات کے قاعدے

سے آئی ہیں - مثال کے طور پر سورہ الضحیٰ اور سورہ الانشراح دونوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالی کی افضال و عنایات کا حوالہ دیا گیا ہے اور خالصتاً آپ کو مخاطب کر کے تسلی دی ہے کہ مشکلات سے گھبرایئے نہیں ' فیروزمندی آپ کے لئے مقدر ہے -

سورہ کوثر ' کافرون اور نصر بھی التفات کی سورتیں ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے یہ خبر دی ہے کہ آپ کے لئے نصرت غیبی ظاہر ہو گی مکہ فتح ہو گا اور جس مشن پر آپ مامور ہیں اس سے سرخرو ہو کر کامیابی سے ہمکنار ہوں گے - ظاہر ہے کہ یہ التفات ہے -

سورہ مزمل اور سورہ الاعلیٰ بھی فی الجملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے التفات کی سورتیں ہیں اگرچہ ان میں قریش کو بھی ضمناً مخاطب کیا گیا ہے -

التفات کے موقع پر چونکہ کلام کا رخ یک لخت بدل جاتا ہے ' اس لئے لوگ عام طور پر وہاں کوئی جملہ حذف مان لیتے ہیں - مثلاً اگر خطاب اہل کتاب سے براہ راست ہو گیا ہے تو ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ خطاب بلاواسطہ کیسے ہو گیا - چنانچہ وہ لفظ قل محذوف مانتے ہیں تاکہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے ہو جائے ' حالانکہ قرآن میں متعدد ایسی آیات موجود ہیں جن میں اہل کتاب سے خطاب قل سے شروع ہوتا ہے - پس معلوم ہوا کہ اگر کلام بواسطہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مقصود ہوتا تو جملے سے پہلے لفظ قل لگایا جا سکتا تھا - اگر نہیں لگایا گیا تو اس کو حذف مان کر اپنی طرف سے لگانا بلاغت کے خلاف ہو گا - مثلاً آیت -

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ
(مائدہ ۱۵)

اے اہل کتاب ' تمہارے پاس ہمارا رسول وہ بہت سی باتیں ظاہر کرتا ہوا آ گیا ہے جو تم کتاب کی چھپاتے رہے ہو

میں بلاغت اسی صورت میں قائم رہتی ہے جب یہ مانا جائے کہ اس میں التفات کے طریقہ پر یہود و نصاریٰ کو مخاطب کر کے تنبیہ کی گئی ہے - اس سے پہلے لفظ قل حذف نہیں ہے -

احوال قیامت کے ضمن میں وہاں پیش آنے والی صورت حال کو کئی جگہ قرآن نے حاضر کے صیغے میں بیان کیا ہے تاکہ صورت حال ممثل ہو کر سامنے آجائے - ان مواقع میں بھی لوگ کچھ حذف مان لیتے ہیں حالانکہ یہ التفات کا موقع ہوتا ہے جس میں کوئی جملہ محذوف ماننا ضروری نہیں - مثال کے طور پر یوں فرمایا -

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۚ وَ

اور ہم نے ہر انسان کا نصیبہ اس کے

نُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۗ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝
(بنی اسرائیل ۱۳ ، ۱۴)

گلے کے ساتھ باندھ دیا ہے اور ہم قیامت کے روز اس کے لئے ایک رجسٹر نکالیں گے جس کو وہ بالکل کھلا ہوا پائے گا - لو پڑھ لو اپنا اعمال نامہ ! آج تم خود ہی اپنا حساب کر لینے کے لئے کافی ہو -

اس آیت میں 'اقراء' سے پہلے 'انسان سے کہا جائے گا' کے الفاظ محذوف ماننا ضروری نہیں - کیونکہ یہاں التفات کا اسلوب ملحوظ ہے اور انسان کو براہ راست مخاطب کر لیا گیا ہے - اس کی مزید مثالیں زخرف ۷۰ ' ذاریات ۱۴ ' طور ۱۳ ' ۱۴ ' ۱۸ ' ۱۹ ' میں دیکھی جا سکتی ہیں -

اسلوب التفات کے فوائد

التفات کے اسلوب کا عام فائدہ سامع کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرنا اور اس کو چونکا کر اپنی بات سنانا ہے - انسان کا حال یہ ہے کہ وہ اس چیز کی طرف متوجہ ہوتا ہے جس سے اس کی کوئی غرض وابستہ ہوتی ہے - یہ رویہ اگر پختہ ہو کر ایک عادت بن جائے تو آدمی بسا اوقات اس چیز کو بھی نہیں دیکھتا جو اگرچہ قریب ہو لیکن اس سے اس کی کوئی غرض وابستہ نہ ہو - التفات کا اسلوب انسان کے اس جمود کو توڑتا اور اس کو غور و فکر کے لئے تیار کرتا ہے -

اس اسلوب کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ایک حقیقت اگر غائب کے صیغہ سے بیان ہوئی ہے تو اس کے ذکر کو زیادہ پر تاثیر بنانے کے لئے اس کو حاضر کے صیغہ میں بھی بیان کر دیا جاتا ہے تاکہ قاری اس کو اپنے سامنے دیکھنے لگے اور وہ اس کے قلب پر اثر نہ کرے - اوپر ہم نے احوال قیامت کی آیات کا جو حوالہ دیا ہے اس میں یہی فائدہ پیش نظر ہے - اس سے قبل کی ایک آیت یوں آئی ہے

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝
(مریم ۷۱)

تم میں سے ہر ایک کو بہر حال اس میں داخل ہونا ہے ' یہ تیرے رب کے اوپر ایک طے شدہ امر واجب ہے -

اس میں التفات ہے لیکن اسلوب کو نہ سمجھنے کے باعث اہل تاویل نے اس کو تمام انسانوں پر منطبق کر کے اس کا یہ مطلب سمجھا ہے کہ ہر انسان کو ' خواہ وہ نیک ہو یا بد ' جہنم پر سے گزرنا ہو گا - حالانکہ اس سے پہلے

منکرین قیامت کا انجام زیر بحث ہے اور انہی کو حاضر کے صیغے میں ممثل کر کے خطاب کیا ہے۔ متقین کے حشر کی خبر آگے آیت ۸۵ میں الگ سے دی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ وہ عزت واحترام کے ساتھ رب کے حضور لے جائے جائیں گے۔

التفات کا اسلوب شدت عتاب اور غصہ کے اظہار کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے لئے حاضر کا صیغہ زیادہ بلیغ ہوتا ہے مثلاً فرمایا۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ○ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ○ (مریم ۸۸، ۸۹)

اور کہتے ہیں کہ خدائے رحمان نے اولاد بنا رکھی ہے۔ یہ تم نے ایک سنگین بات کہی ہے۔

یہاں حاضر کا خطاب انہی لوگوں کے لئے ہے جن کا ذکر پہلی آیت میں غائب کے صیغے سے ہوا ہے۔ شدت خطاب کے موقع پر یہ ضروری نہیں ہوتا کہ جس کے متعلق بات کہی جارہی ہے وہ اس کو سن بھی رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرعون نے غرق ہوتے وقت جب خداوند بنی اسرائیل پر ایمان لانے کا اقرار کیا تو اس موقع پر قرآن مجید میں یہ آیت آئی ہے:

آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (یونس ۹۱)

کیا اب! حالانکہ تم نے اس سے پہلے نافرمانی کی اور تم فساد برپا کرنے والوں میں سے تھے۔

اس آیت میں غائب کے صیغے کے بجائے حاضر کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ اسی اصول پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر کے مقتولین ---- اصحاب قلیب کو مخاطب کیا تھا۔

جس طرح زجر اور غضب کے مضمون کے لئے حاضر کا صیغہ زیادہ بلیغ ہے اسی طرح جہاں کسی کی تحقیر مقصود ہو یا جس کے متعلق بات کہی جارہی ہے اس سے نفرت کا اظہار کرنا ہو تو مخاطب کسی دوسرے کو کر کے بات کہی جاتی ہے۔ مثلاً فرمایا۔

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ○ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ○ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ○ (عبس ۵-۷)

جو بے پروائی برتتا ہے اس کے تو تم پیچھے پڑتے ہو حالانکہ تم پر کوئی ذمہ داری نہیں اگر وہ اپنی اصلاح نہ کرے۔

یہاں بظاہر عتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے لیکن اس کا اصل رخ آپ کی طرف نہیں بلکہ قریش کے لیڈروں کی طرف ہے جن سے کسی خیر کی امید باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ان سے نفرت کے اظہار کے لئے ان سے رخ پھیر کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا ہے۔

اسی طرح کے بعض مواقع میں خطاب واحد سے کرنے کے بجائے جماعت سے خطاب کیا گیا ہے۔ اس کی نمایاں مثال سورہ بقرہ کے چند رکوع ہیں جن میں غائب کے صیغے سے بنی اسرائیل کے چند احوال بیان کئے گئے ہیں' ان کی صورت حال کو تمثیلات سے واضح کیا گیا ہے' پھر یایھاالناس کے عام صیغہ سے ان سے خطاب ہے اور آخر میں آیت ۴۰ سے ان سے راست خطاب بنی اسرائیل کے الفاظ سے ہے۔ یہ طریقہ ان لوگوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جن کی طرف سے انکار یا ناگواری کے اظہار کا اندیشہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی روایات میں آتا ہے کہ آپ جب کسی فرد کو اس کی غلطی پر ٹوکنا چاہتے تو اس کو خطاب کرنے کے بجائے یوں فرماتے کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسا ایسا کام کرتے ہیں۔ اس طریقہ میں بھی مذکورہ مصلحت ہی ملحوظ ہوتی تھی۔

امین احسن اصلاحی

پیداوار پر زکوٰۃ

مؤطا امام مالک کی کتاب الزکوٰۃ کی روایات

امام مالکؒ کے فتوے

امام مالکؒ سے پوچھا گیا کہ زیتون میں عشر یا نصف عشر زکوٰۃ خرچ نکالنے سے پہلے وضع کی جائے گی یا بعد میں- تو انہوں نے کہا کہ خرچ کو نہیں دیکھا جائے گا بلکہ مالک پر اعتماد کیا جائے گا-

امام مالک کا یہ فتویٰ مبہم ہے- انہوں نے خرچ کی بات ٹال دی ہے- اگر زکوٰۃ تیل کے حساب سے لیتے ہیں تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ خرچ کاٹنا پڑے گا- احناف پھل میں سے زکوٰۃ لینے کے قائل ہیں- اس صورت میں خرچ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا- میرے نزدیک اس بارے میں احناف کا مسلک درست ہے-

امام مالک کہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کے **حکم اتوا حقه يوم حصاده** (فصل کا حق ادا کرو اس کے کاٹنے کے دن) سے مراد اس کی زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم ہے- عبد اللہ بن عمر کے نزدیک اس سے مراد ان لوگوں کو دینا ہے جو کٹائی کے وقت بھری دو بھری مانگنے کے لئے آجاتے ہیں-

میرے نزدیک امام مالکؒ کی بات درست ہے لیکن چونکہ حکم عام ہے اس سے مراد سب حقوق ہوں گے- پہلا حق تو سرکاری زکوٰۃ ہے' دوسرے حقوق لوگوں کے ہیں جو انفاق فی سبیل اللہ کے ضمن میں آتے ہیں - روحانی ترقی کے لئے اس طرح کا انفاق نہایت ضروری ہے- امام مالک اگر آیت کو صرف زکوٰۃ سے خاص کر دیتے ہیں تو یہ ٹھیک نہیں-

امام مالک کہتے ہیں کہ جس نے اپنا باغ یا زمین بیچ دی جس میں کھیتی یا پھل ہو لیکن جس کی صلاحیت ابھی ظاہر نہ ہوئی ہو تو اس کی زکوٰۃ خریدنے والے کے ذمہ ہو گی کیونکہ بیع کے وقت اس پر زکوٰۃ واجب ہی نہیں ہوئی تھی- اور اگر فصل تیار ہو اور اس کی بیع جائز ہو تو زکوٰۃ بیچنے والے کے ذمہ ہو گی الا آنکہ وہ یہ شرط لگا دے کہ اس کی زکوٰۃ خریدار ادا کرے گا- **میرے نزدیک یہ فتویٰ درست ہے-**

کس پیداوار پر زکوٰۃ نہیں ہے؟

امام مالک کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص چار وسق کھجور اتارے' چار وسق منقے چنے' چار وسق گندم کاٹے اور چار وسق دالیں کاٹے تو ان کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر نصاب پورا نہیں کیا جائے گا اور اس پر زکوٰۃ نہیں ہو گی- ہاں اگر کھجور کی مختلف اقسام یا دوسری اصناف کی مختلف قسمیں مل کر بقدر نصاب ہو جائیں تو تمام اقسام کو یکجا کر کے ان پر زکوٰۃ عائد کی جائے گی- یعنی اگر گندم کی اقسام بے شمار ہیں تو ان سب کو جمع کر کے دیکھا جائے گا کہ وہ بقدر نصاب ہیں یا نہیں' اگر وہ بقدر نصاب ہو جائیں تو ان پر زکوٰۃ ہو گی- گندم کے رنگ یا مزا یا نام کا لحاظ نہ ہو گا- یہی معاملہ دوسری تمام اجناس مثلاً منقے' دالوں اور دھان میں ہو گا- ہر قسم کی دالیں اور دھان ایک جنس مانے جائیں گے-

شوافع کا مسلک مالکیہ سے مختلف ہے- وہ کہتے ہیں کہ اگر رنگ' نام اور مزے میں فرق ہے تو کسی جنس کی اقسام کو جمع نہیں کیا جائے گا بلکہ ہر ایک کا نصاب الگ ہو گا-

میرے نزدیک مالکیہ کا مسلک درست ہے- شوافع کا مسلک درست نہیں- مالکیہ کا مسلک حضرت عمرؓ کے خط میں دیے گئے فتوے پر مبنی ہے- جس طرح ہر نوع کی بھیڑ بکریاں یا مختلف قسم کے اونٹ یا گائے بھینس جمع کر کے ان کی زکوٰۃ لی جاتی ہے اسی طرح مختلف قسم کی گندم اگرچہ اس کے رنگ' مزا اور نام میں فرق ہو زکوٰۃ کے لئے جمع کی جائے گی- علیٰ ھذا القیاس دھان اور دالیں اور دوسری اجناس- میرے نزدیک جس طرح بھیڑ بکریوں میں سے جمع کرنے کے بعد زکوٰۃ اس قسم سے لینی چاہیے جس کی تعداد زیادہ ہو تو اسی اصول پر اجناس میں بھی جس نوع کی مقدار زیادہ ہو اسی نوع میں سے زکوٰۃ لینی چاہیے-

امام مالک کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے دالوں اور گندم میں فرق کیا تھا- انہوں نے عیسائی تاجروں سے دالوں میں عشر لیا اور منقے سے نصف عشر- ان کی رائے میں دالیں سب ایک قسم ہیں-

میرے نزدیک عیسائی تاجروں سے زکوٰۃ لینے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا- اس عشر یا نصف عشر کی نوعیت ایک محصول یا سیلز ٹیکس کی تھی- جب عیسائی تاجر اشیاء فروخت کرنے کے لئے مدینہ آنے لگے تو حضرت عمر نے کہا کہ عیسائی رعایا کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ جزیہ کا ہے' تجارت کے بارے میں ان پر کوئی ذمہ داری نہیں- لہٰذا انہوں نے بطور تجارتی محصول یا ٹیکس عشر اور نصف عشر ان پر عائد کر دیا- عشر اور نصف عشر کا فرق تجارتی غرض سے رکھا گیا یعنی جس چیز کی مدینہ والوں کو زیادہ ضرورت تھی اس پر نصف عشر کے برابر ٹیکس لگایا گیا-

امام مالک کہتے ہیں کہ اگر دو شخصوں کے درمیان کھجور کے باغ مشترک ہوں اور وہ اس سے آٹھ وسق کھجور حاصل کریں تو ان پر زکوٰۃ نہیں ہو گی اور اگر ان میں سے ایک کے حصے میں پانچ وسق آئیں اور دوسرے کے حصے میں چار وسق یا اس سے کم تو پانچ وسق کے مالک پر زکوٰۃ ہو گی اور دوسرے پر زکوٰۃ نہ ہو گی۔ اور یہی طریقہ تمام شریکوں کے لئے ہو گا چاہے گندم کاٹیں یا انگور چنیں یا سلے۔ جب ہر ایک کا حصہ پانچ وسق ہو گا تو زکوٰۃ ہو گی' اگر حصہ پانچ وسق سے کم ہو گا تو زکوٰۃ نہیں ہو گی۔

احناف کے نزدیک مقدار کا سوال نہیں' مال قلیل ہو یا کثیر وہ اس پر زکوٰۃ مانتے ہیں' شوافع کہتے ہیں کہ شریک ایک ساتھ زکوٰۃ دیں۔

میرے نزدیک شریک اور خلط میں فرق ہے۔ جہاں شریک ہوں تو مال کی زکوٰۃ ایک ہی جگہ کاٹی جائے گی۔ اگر خلیط ہوں تو مالکیہ کے مسلک کے مطابق زکوٰۃ ہو گی۔ شریکوں کے معاملے میں شوافع کی رائے صحیح ہے' خلیطوں کے بارے میں نہیں۔

امام مالک کہتے ہیں کہ ایسی تمام اصناف از قسم گندم' کھجور' منقے اور غلہ جن کی زکوٰۃ ادا کر دی گئی ہو' اگر طویل مدت تک روک لی گئی ہوں اور کئی سال روکے رکھنے کے بعد مالک ان کو بیچے تو ان کی قیمت پر زکوٰۃ نہیں ہو گی جب تک اس قیمت پر ایک سال نہ گزر جائے بشرطیکہ یہ اقسام تجارت کے لئے نہ روکی گئی ہوں بلکہ ان کی حیثیت گھریلو سامان کی ہو۔ ہاں اگر یہ بطور سامان تجارت ہوں تو مالک پر اس وقت زکوٰۃ ہو گی جب وہ مال فروخت کرے گا اور ایک سال اس روز سے شمار ہو گا جس روز اس شخص نے ان کی زکوٰۃ دی تھی جس سے اس نے مال خریدا تھا۔

میرے نزدیک یہ فتویٰ درست ہے۔ مالکیہ احتکار کی اجازت نہیں دیتے۔ تاجر مال کو روک نہیں سکتا' اس کو مال پر اجنبے پر زکوٰۃ دینی ہو گی۔

پھلوں' لکڑیوں اور سبزیوں کی زکوٰۃ

اس باب میں بھی کوئی مرفوع حدیث یا اثر صحابہ نہیں' امام مالکؒ کے فتوے ہیں۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ کسی بھی قسم کے پھل مثلاً انار' فرسک' انجیر یا ان جیسے دوسرے پھلوں پر زکوٰۃ نہیں اور نہ ہی لکڑیوں اور سبزیوں پر زکوٰۃ ہے۔ ان کی پیداوار کو اگر فروخت کر دیا جائے تو قیمت میں سے بھی زکوٰۃ وضع نہیں کی جائے گی جب تک اس پر پورا سال نہ گزر جائے اور وہ نصاب سے زائد نہ ہو۔

اس فتوے کی علت یا مناط حکم اجناس میں قوت اور ادخار کا پایا جانا ہے۔ میرے نزدیک یہ علت درست نہیں۔ یہ اللہ اور رسول کی بتائی ہوئی علت نہیں۔ اس کی بنا کسی نص پر نہیں اور نہ ہی کسی حدیث پر ہے۔ اس

معاملے میں احناف کا مسلک درست ہے کہ زمین میں جو چیز پیدا ہو گی اس پر زکوٰۃ ہو گی۔ اس میں نصاب کی قید ضروری ہے جو پیغمبر نے لگائی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے گھریلو استعمال کے لئے کوئی جنس پیدا کرتا ہے تو وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہو گی لیکن تجارتی مقاصد کے لئے ہر زمینی پیداوار پر زکوٰۃ ہو گی۔

غلام' گھوڑے اور شہد کی زکوٰۃ

حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ دِينَارٍ عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ عَنْ عِرَاكِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَيْسَ عَلَى الْمُسْلِمِ فِي عَبْدِهِ وَلَا فِي فَرَسِهِ صَدَقَةٌ

ترجمہ: ابی ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان پر اس کے غلام اور گھوڑے میں زکوٰۃ نہیں۔

غلامی کا مسئلہ تو اب ختم ہو چکا اس لئے غلاموں کی زکوٰۃ کا معاملہ صرف علمی حد تک رہ گیا ہے۔ گھوڑے کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکم دیا ہے وہ ایسے گھوڑوں کے بارے میں ہے جو ضرورت اور استعمال کے لئے رکھے جائیں۔ ان پر زکوٰۃ نہیں ہو گی۔ ہمارے زمانے میں گھوڑے تجارت کے لئے پالے جاتے ہیں اور ان کی خاص نسلوں کی افزائش کے لئے بڑے بڑے فارم وجود میں آ گئے ہیں۔ یہ تجارت نہایت منافع بخش ہے۔ ان گھوڑوں کا حکم مال تجارت کا ہو گا' ان پر زکوٰۃ لگنی چاہئے۔ دوسرے مویشیوں کی طرح صرف ایک مقررہ مقدار زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہو گی۔

اس بارے میں احناف کا مسلک یہ ہے کہ گھوڑی پر زکوٰۃ لی جائے گی لیکن گھوڑے پر نہیں۔ میرے نزدیک مسلک کے نقل کرنے میں کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ تجارت کے لئے پالے گئے گھوڑے اور گھوڑیاں زکوٰۃ کے لئے یکساں متصور ہوں گے۔

حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ أَنَّ أَهْلَ الشَّامِ قَالُوا لِأَبِي عُبَيْدَةَ بْنِ الْجَرَّاحِ خُذْ مِنْ خَيْلِنَا وَرَقِيقِنَا صَدَقَةً فَأَبَى ثُمَّ كَتَبَ إِلَى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَأَبَى عُمَرُ. ثُمَّ كَلَّمُوهُ أَيْضًا فَكَتَبَ

ترجمہ: سلیمان بن یسار کہتے ہیں کہ اہل شام نے ابو عبیدہ بن جراحؓ سے کہا کہ ان کے گھوڑوں اور غلاموں سے زکوٰۃ لی جائے تو انہوں نے انکار کیا۔ اس بارے میں حضرت عمرؓ کو لکھا تو انہوں نے بھی انکار کیا۔ لوگوں نے

إِلَى عُمَرَ فَكَتَبَ إِلَيْهِ عُمَرُ إِنْ أَحَبُّوا فَخُذْهَا مِنْهُمْ وَارْدُدْهَا عَلَيْهِمْ وَارْزُقْ رَقِيقَهُمْ. قَالَ مَالِكٌ مَعْنَى قَوْلِهِ رَحِمَهُ اللَّهُ وَارْدُدْهَا عَلَيْهِمْ يَقُولُ عَلَى فُقَرَائِهِمْ

دوبارہ اس معاملہ میں بات کی تو ابو عبیدہ نے دوبارہ حضرت عمرؓ کو لکھا۔ اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے لکھا کہ اگر وہ زکوٰۃ دینا پسند کرتے ہیں تو لے لو اور ان ہی کو لوٹا دو۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ان ہی کو لوٹانے کا مطلب یہ تھا کہ ان کے فقرا میں تقسیم کر دو۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل شام کے پاس غلام اور گھوڑے وافر مقدار میں بطور مال غنیمت جمع ہو گئے ہونگے چنانچہ انہوں نے زکوٰۃ دینے پر اصرار کیا تو حضرت عمرؓ نے اجازت دے دی۔ مال کو فقراء میں تقسیم کرنے کا امام مالک کا نکتہ زکوٰۃ کے اس بنیادی اصول سے ماخوذ ہے کہ توخذ من اغنیائہم وترد الی فقراءہم مال کو امیروں سے وصول کر کے ان کے غریبوں کو لوٹا دیا جائے۔

۳- حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي بَكْرِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ أَنَّهُ قَالَ: جَاءَ كِتَابٌ مِنْ عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ إِلَى أَبِي وَهُوَ بِمِنًى أَنْ لَا يَأْخُذَ مِنَ الْعَسَلِ وَلَا مِنَ الْخَيْلِ صَدَقَةً

ترجمہ عمرو بن حزم روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کا خط ان کے والد کو منی میں ملا کہ وہ شہد اور گھوڑے میں سے زکوٰۃ نہ لیں۔

حضرت عمر بن عبد العزیز کی یہ ہدایت بھی عام قسم کے شہد کے چھتوں کے بارے میں ہے جو درختوں یا پہاڑوں میں لگتے ہیں۔ گھوڑے بھی وہی مراد ہیں جو لوگ ضرورت کے لئے یا شان و شوکت کے اظہار کے لئے رکھتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں شہد کی پیداوار بھی ایک صنعت بن چکی ہے اور گھوڑوں کی افزائش بین الاقوامی تجارت کا ایک حصہ ہے۔ اب ایک اسلامی ریاست شہد اور گھوڑوں کو مال تجارت کی حیثیت دے گی اور اس پر زکوٰۃ عائد کرے گی۔

اہل کتاب اور مجوسیوں کا جزیہ

۱- حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ

ترجمہ ابن شہاب سے روایت ہے،

قَالَ: بَلَغَنِي أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَخَذَ الْجِزْيَةَ مِنْ مَجُوسِ الْبَحْرَيْنِ وَأَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ أَخَذَهَا مِنْ مَجُوسِ فَارِسَ وَأَنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ مِنَ الْبَرْبَرِ

کہتے ہیں کہ یہ بات مجھے پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحرین کے مجوس سے جزیہ لیا، حضرت عمرؓ بن خطاب نے فارس کے مجوس سے جزیہ لیا اور حضرت عثمانؓ بن عفان نے بربر کے مجوسیوں سے جزیہ لیا۔

قرآن میں یہود اور نصاری سے جزیہ لینے کا حکم ہے۔ جب فتوحات کا دائرہ ایران، مصر اور بلاد مغرب تک وسیع ہو گیا تو دوسرے مذاہب کے لوگ مسلمانوں کے زیر اثر آ گئے۔ اب سوال پیدا ہوا کہ مجوسیوں کے ساتھ معاملہ کس طرح کیا جائے۔ اس معاملہ میں صحابہ کرامؓ کی رائے یہ ہوئی کہ مجوس کے ساتھ اہل کتاب کا سا سلوک کرو۔ یہ سلوک صرف جزیہ کے بارے میں ہے، ذبیحہ یا نکاح کے معاملات کے لئے نہیں۔ اور مجوس ہی نہیں تمام غیر مسلموں کے ساتھ یہی سلوک ہو گا اور وہ شبہ اہل کتاب سمجھے جائیں گے۔ صرف مشرکین اہل عرب کا معاملہ مختلف تھا۔ ان کے لئے اسلام تھا یا تلوار، کیونکہ ان کے اوپر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے حجت تمام ہو چکی تھی۔ نہ ان کو غلام بنایا جا سکتا تھا اور نہ ان سے جزیہ لیا جا سکتا تھا۔ غیر مسلموں میں مفتوح اور معاہد اہل ذمہ کے درمیان فرق کیا جائے گا۔ مفتوح اہل ذمہ کے بارے میں حکومت کی صوابدید پر معاملہ ہو گا جب کہ اہل معاہد ذمہ کے ساتھ معاملہ ان شرائط کے مطابق ہو گا جو معاہدہ میں طے پا جائیں گی۔

۲- حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ عَنْ أَبِيهِ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ ذَكَرَ الْمَجُوسَ فَقَالَ: مَا أَدْرِي كَيْفَ أَصْنَعُ فِي أَمْرِهِمْ. فَقَالَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ عَوْفٍ أَشْهَدُ لَسَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: سُنُّوا بِهِمْ سُنَّةَ أَهْلِ الْكِتَابِ

ترجمہ محمد بن علی اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ بن خطاب نے لوگوں سے مجوس کے بارے میں استفسار کیا کہ میں ان کے ساتھ کیا معاملہ کروں تو عبد الرحمٰن بن عوفؓ نے کہا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کے ساتھ اہل کتاب کا معاملہ کرو۔

یہ روایت ترتیب میں مذکورہ بالا روایت سے پہلے آنی چاہیے تھی-اصل میں یہ مسئلہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں پیش آیا-انہوں نے لوگوں سے اس کے متعلق پوچھا تو حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث اس بارے میں پیش کر دی-حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ بڑے بلند پایہ صحابی ہیں-ان کی خبر واحد کی بڑی اہمیت ہے اور اسی کے مطابق خلفائے راشدین نے عمل کیا' جیسا کہ اوپر کی روایت میں حضرت عمرؓ کے علاوہ حضرت عثمانؓ کے فیصلے کا حوالہ دیا گیا ہے-

- حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ أَسْلَمَ مَوْلَى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ ضَرَبَ الْجِزْيَةَ عَلَى أَهْلِ الذَّهَبِ أَرْبَعَةَ دَنَانِيرَ وَعَلَى أَهْلِ الْوَرِقِ أَرْبَعِينَ دِرْهَمًا مَعَ ذَلِكَ أَرْزَاقُ الْمُسْلِمِينَ وَضِيَافَةُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ ۔

ترجمہ حضرت عمرؓ بن خطاب کے آزاد کردہ غلام اسلم روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ذمیوں کے اوپر سونے پر ۴ دینار اور چاندی پر چالیس درہم جزیہ مقرر کیا اور مزید یہ کہ مسلمانوں کو کھانا کھلائیں اور تین روز تک مہمان نوازی کریں-

یہ اہل ذمہ کے اوپر جزیہ کی شرح ہے-بیس دینار کے اوپر چار دینار جزیہ ہوگا اور دو صد درہم کے اوپر چالیس درہم جزیہ یعنی دونوں صورتوں میں پانچواں حصہ اور اس پر مزید یہ کہ مسلمانوں کو کھانا کھلائیں اور تین روز تک مہمانوں کی ضیافت کریں-اسلامی حکومت کو حق ہے کہ اہل ذمہ سے ان کی حفاظت کے بدلے میں جزیہ مقرر کرے-اسی حق کے تحت حضرت عمرؓ نے یہ شرح مقرر کی-اصولی طور پر یہ شرح زکوۃ کی شرح سے کم نہیں ہونی چاہیے-زیادہ میں کوئی مضائقہ نہیں-اس کی مقدار اسلامی حکومت کی صوابدید پر ہے-

- حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ أَبِيهِ أَنَّهُ قَالَ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ إِنَّ فِي الظَّهْرِ نَاقَةً عَمْيَاءَ. فَقَالَ عُمَرُ ادْفَعْهَا إِلَى أَهْلِ بَيْتٍ يَنْتَفِعُونَ بِهَا. قَالَ فَقُلْتُ وَهِيَ عَمْيَاءُ فَقَالَ عُمَرُ يَقْطُرُونَهَا بِالْإِبِلِ. قَالَ فَقُلْتُ كَيْفَ تَأْكُلُ مِنَ الْأَرْضِ؟ قَالَ فَقَالَ عُمَرُ أَمِنْ نَعَمِ الْجِزْيَةِ هِيَ أَمْ مِنْ نَعَمِ الصَّدَقَةِ؟ فَقُلْتُ بَلْ مِنْ نَعَمِ الْجِزْيَةِ فَقَالَ عُمَرُ أَرَدْتُمْ

ترجمہ زید بن اسلم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عمرؓ بن خطاب کو بتایا کہ شتر خانے میں ایک اندھی اونٹنی ہے-حضرت عمر نے فرمایا کہ اس کو کسی گھر والے کے پاس بھیج دو تاکہ اس سے فائدہ اٹھائیں-کہتے ہیں کہ اس پر میں نے کہا وہ تو اندھی ہے تو

وَاللّٰهِ أَكْلَهَا. فَقُلْتُ إِنَّ عَلَيْهَا وَسْمَ الْجِزْيَةِ فَأَمَرَ بِهَا عُمَرُ فَنُحِرَتْ، وَكَانَ عِنْدَهُ صِحَافٌ تِسْعٌ فَلَا تَكُونُ فَاكِهَةٌ وَلَا طَرِيفَةٌ إِلَّا جَعَلَ مِنْهَا فِي تِلْكَ الصِّحَافِ فَبَعَثَ بِهَا إِلَى أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيَكُونُ الَّذِي يَبْعَثُ بِهِ إِلَى حَفْصَةَ ابْنَتِهِ مِنْ آخِرِ ذَلِكَ فَإِنْ كَانَ فِيهِ نُقْصَانٌ كَانَ فِي حَظِّ حَفْصَةَ قَالَ فَجَعَلَ فِي تِلْكَ الصِّحَافِ مِنْ لَحْمِ تِلْكَ الْجَزُورِ فَبَعَثَ بِهِ إِلَى أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَمَرَ بِمَا بَقِيَ مِنْ لَحْمِ تِلْكَ الْجَزُورِ فَصُنِعَ فَدَعَا عَلَيْهِ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارَ - قَالَ مَالِكٌ لَا أَرَى أَنْ تُؤْخَذَ النَّعَمُ مِنْ أَهْلِ الْجِزْيَةِ إِلَّا فِي جِزْيَتِهِمْ

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ وہ اس کو اونٹوں کی قطار میں لگالیں گے-کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ وہ زمین سے کیسے کھائے گی-اس پر حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ آیا وہ جزیہ کے جانوروں میں سے ہے یا صدقے کے جانوروں میں سے-میں نے جواب دیا کہ یہ جزیہ کے جانوروں میں سے ہے-حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تمہارا ارادہ' اللہ کی قسم' اس کو کھانے کا ہے-تو میں نے جواب دیا کہ اس کے اوپر تو جزیہ کا نشان ہے-حضرت عمرؓ نے حکم دے دیا کہ اس کو ذبح کیا جائے-حضرت عمر کے پاس نو طشتریاں تھیں اور ان کا طریقہ یہ تھا کہ کوئی بھی پھل یا اچھی چیز ہوتی تو وہ ان طشتریوں میں حصے کرکے حضور کی ازواج کو بھیجتے اور جو کچھ بھیجتے اس کا آخری حصہ حضرت حفصہ کا ہوتا تاکہ جو کمی بھی ہو وہ حضرت حفصہ کے حصے میں آئے-اسلم کہتے ہیں کہ اس اونٹنی کے گوشت کے حصے بنا کر ازواج مطہرات کو بھیجے گئے اور جو گوشت باقی بچا اس [illegible] تا۔

کرنے کا حکم دیا گیا اور اس پر مہاجرین اور انصار کی دعوت کی گئی۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ میری رائے میں اہل ذمہ سے سوائے جزیہ کے جانور نہیں لئے جا سکتے۔

اس روایت سے کئی باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ جزیہ میں جانور بھی لئے جا سکتے ہیں۔ رہا اونٹنی کے اندھے ہونے کا سوال تو ہو سکتا ہے کہ دینے والے نے دھوکہ سے دے دی ہو یا اگر پوری اونٹنی جزیہ میں نہ بنتی ہو تو اندھی قبول کر لی گئی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وصولی کے بعد اندھی ہو گئی ہو۔ دوسری یہ کہ جزیہ کے جانور بیت المال کا حصہ ہوتے تھے اور حضور کی ازواج مطہرات کی کفالت بیت المال سے ہوتی تھی۔ تیسری یہ کہ حضرت عمر کا طریقہ یہ تھا کہ جو کچھ بھی ازواج مطہرات کو بھجواتے تو سب کے حصے کر کے بھجواتے اور اپنی بیٹی حضرت حفصہ کا حصہ آخر میں نکالتے تاکہ جو کمی بھی ہو وہ حضرت حفصہ کے حصہ میں آئے تاکہ خلیفہ پر بیٹی کے معاملہ میں طعن نہ ہو۔ چوتھی یہ کہ ازواج مطہرات کو بھجوانے کے بعد جو کچھ بچا وہ پکا کر مہاجرین و انصار کی دعوت کر دی گئی تاکہ وہ ضائع نہ ہو اور کسی کو اس کے استعمال پر اعتراض بھی نہ ہو۔

ترتیب۔ سعید احمد

افادات فراہی
خالد مسعود

توحید پر قرآن کا استدلال

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے چار امور کے بارے میں اپنی تعلیم کے حق میں بکثرت دلائل دیئے ہیں۔ ایک اللہ تعالیٰ کی وحدانیت' دوسرا اللہ تعالیٰ کو پکارنے میں شرک کا ابطال' تیسرا غیر اللہ کی شفاعت کا مسئلہ اور چوتھا اشیاء کی حلت و حرمت۔ آخر الذکر امر یعنی اشیاء کو بلا شرعی دلیل کے اپنی مرضی سے حرام و حلال قرار دے لینا نہایت سنگین حرکت ہے۔ ا رچونکہ باطل عبادت کا زیادہ مدار اسی پر ہے اس لئے قرآن مجید نے اس مسئلہ پر بکثرت بحث کی ہے۔

مذکورہ چاروں امور نہایت اہم ہیں۔ قرآن نے ان کے ضمن میں یہ بتایا ہے کہ ان میں حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔ ساتھ ہی اس نے اپنی حجت بھی واضح کی ہے کیونکہ یہ امور ایسے ہیں کہ ان میں غلطی ان لوگوں کو بھی شرک کے گڑھے میں لا گراتی ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کی کتاب پر ایمان لانے والے ہوتے ہیں۔ اس پر قرآن نے بدیں الفاظ متنبہ کیا ہے۔

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ○ (یوسف ۱۰۶)

اور ان میں سے اکثر اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے مگر اس طرح کہ ساتھ ہی اس کے شریک بھی ٹھہرائے ہوئے ہیں۔

ان امور کی اہمیت کے پیش نظر اس بات کی ضرورت ہے کہ ان میں قرآن کی حجت کو واضح کیا جائے اور اس بارے میں لوگ جو غلطی کرتے ہیں اس کے اسباب کو دریافت کیا جائے لیکن یہاں ہمارے لئے اس کا موقع نہیں۔ البتہ ہم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے مسئلہ میں قرآن کے دلائل کی وضاحت کریں گے۔

توحید کی دلیل صفات الٰہیہ سے

جہاں تک اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا تعلق ہے یہ اللہ تعالیٰ کی نمایاں ترین صفات سے ثابت ہوتی ہے مثلاً یہ کہ وہ خالق اور قادر مطلق ہے' اس کی رحمت اور بخشش نہایت وسیع ہے' اس کا علم ہر شے کو محیط ہے اور وہ ایک ایسا عادل ہے جو ظلم سے کبھی راضی نہیں ہوتا اور جب وہ کسی بھی ظلم سے راضی نہیں ہوتا تو شرک جیسے سب سے بڑے ظلم سے وہ کیسے راضی ہو سکتا ہے۔ قرآن جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفت قدرت کے کمال کے حوالہ سے یہ ثابت کرتا ہے کہ اس صفت میں اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں اسی طرح وہ مخلوق --- اور مخلوق بھی کمزور ترین مخلوق --- کو الٰہ بنالینے کی شناعت کو واضح کرتا ہے۔ مثلاً اس نے بتوں کی مذمت میں کہا ہے۔

وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْــٴًـا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ○ (حج ۷۳)

اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اس سے اس کو بچا بھی نہیں پائیں گے۔ طالب اور مطلوب دونوں ہی ناتواں!

اس آیت میں بتوں کی تحقیر کا وہی انداز ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت اختیار کیا تھا جب انہوں نے اپنی قوم کے بتکدہ میں داخل ہو کر بڑے بت کے سوا تمام بتوں کے اعضاء توڑ دیے۔ لوگوں نے جب ان سے استفسار کیا کہ کیا یہ حرکت تم نے کی ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا۔

بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِیْرُهُمْ هٰذَا فَسْــٴَـلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا یَنْطِقُوْنَ ○ (انبیاء ۶۳)

بلکہ ان کے اس بڑے نے یہ حرکت کی ہے تو انہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہیں۔

یہ ایک ایسی تحقیر آمیز اور مسکت حجت تھی جس کے جواب میں قوم کے پاس اس قرار کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ بت بولنے پر قادر نہیں۔

میرے نزدیک بتوں کی بے بسی کا اس سے زیادہ بلیغ اظہار نہیں ہو سکتا کہ یہ کہا جائے کہ وہ مکھی سے بھی زیادہ کمزور ہیں یا یہ کہا جائے کہ وہ جانوروں سے بڑھ کر گونگے ہیں۔ یہ ان کی انتہائی تذلیل کا اسلوب ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مذکورہ جواب میں ایک اور بلاغت بھی ہے۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ بڑے بت سے پوچھ لو بلکہ یہ کہا کہ ان مجروح بتوں سے پوچھو۔ اس میں بلاغت یہ ہے کہ اپنی مظلومیت کا فوری اور موثر اظہار ایک مظلوم ہی کر سکتا ہے۔ اسی اصول پر قیامت کے روز اس مظلوم لڑکی سے' جس کو دنیا میں زندہ

دفن کر دیا گیا تھا' پوچھا جائے گا کہ کس جرم کی پاداش میں اس کو یہ سزا دی گئی تھی۔

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ○ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ○ (تکویر ۹)

اور جب زندہ در گور کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر ماری گئی۔

توحید کے آفاقی دلائل

قرآن مجید نے آفاق کی شہادتوں کی مدد سے الوہیت کو ثابت کیا ہے۔ جس چیز کا مشاہدہ کائنات میں سب سے نمایاں طور پر ہو رہا ہے وہ اس کا حسن ہے' جس کی طرف قرآن نے یوں توجہ دلائی ہے

اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ (سجدہ ۷)

وہ ہے جس نے جو چیز بھی بنائی ہے خوب بنائی ہے۔

کائنات کا دوسرا اہم مشاہدہ اس کے مختلف اجزا کے درمیان سازگاری ہے۔ فرمایا

وَمِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○ (ذاریات ۴۹)

اور ہر چیز سے ہم نے پیدا کیے جوڑے تاکہ تم یاد دہانی حاصل کرو۔

اس سازگاری سے دلیل کا جو پہلو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کا خالق بڑی حکمت والا ہے اور اس نے جو چیز بھی بنائی ہے وہ حکمت پر مبنی ہے۔

قرآن نے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا حوالہ بکثرت دیا ہے جس کا اظہار کائنات کے ہر گوشے میں ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کے حوالے سے توحید پر دلیل قائم کی ہے اور اس سے نبوت اور قیامت پر بھی استدلال کیا ہے۔

جب ہم کائنات میں حسن اور رحمت کا مشاہدہ کرتے اور اس کے اجزا کے درمیان سازگاری دیکھتے ہیں تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ یہ کائنات مخلوق ہے جس کا پیدا کرنے والا ایک رحیم و حکیم الٰہ ہے۔

مخلوقات کے وجود سے خالق کا وجود خود بخود ثابت ہو جاتا ہے۔ جب اس نے پیدا کیا تو اس صفت سے اس کا کمال علم اور کمال قدرت رکھنا بھی ثابت ہوا۔ اسی لئے فرمایا :

وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِیْزُ الْعَلِیْمُ ○ (زخرف ۹)

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ لازماً یہی جواب دیں گے کہ ان کو خدائے عزیز و علیم نے پیدا کیا ہے۔

اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (ملک ۱۴)

کیا وہ نہیں جانے گا جس نے پیدا کیا ہے

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ○ (انعام : ۹۶)

وہی بر آمد کرنے والا ہے صبح کا اور اس نے رات سکون کی چیز بنائی اور سورج اور چاند اس نے ایک حساب سے رکھے - یہ خدائے عزیز وعلیم کی منصوبہ بندی ہے -

یاد رہے کہ آسمان سے زمین تک کائنات کے تمام امور حکمت کے مطابق جاری ہیں - یہ جہان شدید قوتوں کے اختلاف کے باوجود قائم ہے - مخلوقات کی مختلف طبیعتیں ایک دوسرے کی مددگار ہیں اور یہ سارا جہان ایک ایسے ہدف کی طرف رواں دواں ہے جس کا نہ اس کو علم حاصل ہے اور نہ وہ اس کو جاننے کی قدرت رکھتا ہے - پھر کائنات کا مجموعی مزاج ایسا ہے کہ اس کا رجحان حکمت کی طرف نہایت واضح نظر آتا ہے - یہ سب صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ کائنات پر ایک ایسے مدبر حکیم کا حکم نافذ ہو جس کی قدرت ، علم اور رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے - اللہ تعالیٰ کا عام اختیار اور کامل علم اس کے سوا کسی دوسرے کے لئے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا کہ وہ کائنات میں حصہ داری کا دعوی کرے - اسی لئے فرمایا -

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۚ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○

(المومنون ۹۱ ، ۹۲)

خدا نے کسی کو اپنی اولاد نہیں قرار دیا اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور معبود شریک ہے - اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود جو کچھ اس نے پیدا کیا ہوتا اس کو لے کر الگ ہو جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا - خدا ایسی باتوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں - وہ غائب و حاضر کا جاننے والا ہے اور برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں -

قرآن نے متعدد ایسی آفاقی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو ایک الٰہ حق کے وجود پر دلیل ہیں - مثلاً فرمایا :

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ۚ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ○ (النمل ۸۸)

اور تم پہاڑوں کو دیکھ کر گمان کرتے ہو کہ وہ ٹکے ہوئے ہیں حالانکہ وہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے - یہ اس خدا کی کاریگری ہو گی جس نے ہر چیز کو محکم کیا - بے شک وہ ہر اس چیز سے باخبر ہے جو تم کر رہے ہو -

آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم تو یہ سمجھتے ہو کہ پہاڑ اپنی اصلیت میں جامد ہیں لیکن حقیقت میں معاملہ اس کے برعکس ہے - قیامت کے روز یہ ریت کی مانند ہو جائیں گے بلکہ بے وزن ہو کر بادلوں کی طرح اڑنے لگیں گے - اس سے معلوم ہوا کہ ان کا وجود اور مضبوطی اللہ تعالیٰ کی صناعت کی بدولت ہے جس نے ہر شے کو مضبوطی عطا فرمائی -

اسی کی مانند دوسری آیت ہے :

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۚ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ○ (فاطر ۴۱)

اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ ٹل نہ جائیں - اور اگر وہ ٹل جائیں تو اس کے بعد کوئی اور ان کو تھامنے والا نہیں بن سکتا - بے شک وہ نہایت حلیم و غفور ہے -

ان آیات سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اجسام کی صفات مثلاً نرمی و سختی ، حرارت و برودت ، حرکت و سکون وغیرہ اور اسی طرح نفوس کی صفات مثلاً علم ، قدرت ، رغبت ، نفرت ، وغیرہ ان کے مادہ کا جزو نہیں ہیں - اگر ایسا ہوتا تو ایک ہی مادہ سے بننے والی مخلوقات ان صفات میں ایک جیسی ہوتیں ، وہ ایک حالت سے دوسری حالت میں نہ بدل سکتیں اور مختلف شکلوں اور طبائع کے مالک اجزا ان سے موافقت پیدا نہ کر سکتے - پس یہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو تمام اجسام اور نفوس پر تصرف رکھتی ہے -

توحید کے انفسی دلائل

نفس کی دو جہتیں ہیں - ایک جہت کا تعلق عقل ، علم اور قلب و نظر سے ہے جب کہ دوسری جہت کا

تعلق ذوق ' جذبات اور لذت سے ہے - قرآن نے ان دونوں حوالوں سے توحید پر دلیلیں قائم کی ہیں - ہم ان کی قدرے وضاحت کرتے ہیں -

عقلی جہت

نفس کو ادراک ' فہم اور نطق کی جو صلاحیتیں حاصل ہیں ان کے ذریعے وہ اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ وہ اپنے جسم کا ایسا مالک ہے جو ارادہ اور فیصلہ کی قدرت رکھتا ہے - لہذا سب سے پہلا اور قریبی علم اس کو اپنے وجود ' اپنے علم ' ارادہ اور اختیاری کے بارے میں حاصل ہے - ان معاملات میں نہ اس کو کسی قسم کا شک لاحق ہوتا ہے اور نہ اس پر کسی دلیل کی اس کو کوئی حاجت ہوتی ہے -

نفس کے علم میں یہ بات بھی ہے کہ وہ ایک واحد ذات ہے جس کو علم ' ارادہ اور اختیار حاصل ہے لیکن اگر ان صفات میں سے کوئی ایک صفت بھی اس سے سلب کر لی جائے تو وہ پہلی سی ذات نہیں رہے گی بلکہ دوسری مخلوق بن جائے گی -

نفس کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ جو صاحب علم و ارادہ ہوا ہے تو اس حیثیت سے کہ یہ حادث ہے - اس کے سامنے اگر یہ سوال آئے کہ بالفرض وہ علم و ارادہ سے عاری ایک لطیف جوہر کی حیثیت سے نئی مخلوق بن جائے تو کیا یہ جوہر قدیم ہو گا یا حادث ' تو نفس پورے یقین کے ساتھ اس سوال کا یہ جواب دے گا کہ یہ جوہر بھی حادث ہو گا - نفس کا یہ علم پہلے اپنی ذات سے اور پھر کائنات کی دوسری اشیاء سے متعلق ہے - کیونکہ نفس پہلے اپنی ذات کو جانتا ہے اور خارج کی اشیاء کی طرف بعد میں متوجہ ہوتا ہے - اگر نفس قدیم ہوتا تو قدامت چونکہ اس کی صفت ہوتی اس لئے وہ کشادہ دلی کے ساتھ اس کا شعور رکھتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدامت کا تصور بھی اس کے بس میں نہیں - اس کا ادراک کرنے سے وہ عاجز اور اس پر غور کرنے سے قاصر ہے - لہذا یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ وہ جوہر ' جو نفس کو محیط ہے ' حادث ہے -

نفس کا حوالہ اگرچہ ایک محدود چیز کا حوالہ تھا لیکن اس سے وہ تین حقائق سامنے آئے جو اوپر مذکور ہوئے - انھی کی روشنی میں کائنات کے حوالے سے غور کیجئے تو اس کے لئے بھی تین اصول بر آمد ہوتے ہیں

اولاً یہ کہ کائنات کا ایک الٰہ ہے جو اس کی تدبیر کرتا اور اس پر تصرف کرتا ہے -

ثانیاً یہ کہ وہ الٰہ صرف ایک ہے کیونکہ اگر اس کو ایک نہ مانا جائے تو اس کی حیثیت ایک محتاج ' عاجز اور حادث کی رہ جاتی ہے جو الٰہ بننے کے قابل نہیں -

ثالثاً یہ کہ نفس کا ایک خالق ہے جو اس کا جزو نہیں - وہی ہے جس نے اس کو خلق کیا ' اس کو صلاحیتیں دیں اور سننے والا دیکھنے والا بنایا - لہذا نفس کا اپنے معاملات میں اختیار رکھنا ' اس کا ایک ذات ہونا اور عاجز ہونا اس بات پر دلیل

ہے کہ اس کا رب ہر چیز پر اصل متصرف ہے ' وہ واحد ہے اور ہر چیز پر قادر ہے -

ذوقی جہت

ذوقی اعتبار سے نفس ناشکری کو برا فعل سمجھتا ہے - جب وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے واقف ہو جائے تو تکبر اور غفلت اس کو خدا کی شکر گزاری سے نہیں پھیر سکتے - اسی لئے قرآن نے نعمتوں کے حوالے سے توحید کی طرف توجہ دلائی ہے - فرمایا :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ ۚ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّهِ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۚ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ○
(فاطر ۳)

اے لوگو ! تمہارے اوپر اللہ کا جو انعام ہے اس کا دھیان کرو - کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق بہم پہنچاتا ہو ! اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو -

دوسری حقیقت یہ ہے کہ نفس اپنی طبیعت کے لحاظ سے اپنے اختیار میں کسی شریک کو برداشت نہیں کرتا - ہمارے خاندانوں کے بیشتر معاملات میں اس حقیقت کو تسلیم کیا جاتا ہے - انسان جب اپنے لئے شریک کو تسلیم نہیں کرتا تو کائنات کے رب کے لئے وہ کیوں شریک تسلیم کر لیتا ہے - قرآن نے یہ استدلال کرتے ہوئے فرمایا

ضَرَبَ لَكُمْ مَثَلًا مِنْ أَنْفُسِكُمْ ۖ هَلْ لَكُمْ مِنْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِنْ شُرَكَاءَ فِي مَا رَزَقْنَاكُمْ فَأَنْتُمْ فِيهِ سَوَاءٌ تَخَافُونَهُمْ كَخِيفَتِكُمْ أَنْفُسَكُمْ ۚ
(روم : ۲۸)

وہ تمہارے لئے خود تمہارے اندر سے ایک تمثیل بیان کرتا ہے - کیا ہم نے تم کو جو رزق و فضل بخشا ہے اس میں تمہارے مملوکوں میں سے بھی کچھ شریک ہیں کہ تم اور وہ اس میں برابر کے حقوق رکھنے والے بن گئے ہو اور جس طرح تم اپنوں کا لحاظ کرتے ہو اسی طرح ان کا بھی لحاظ کرتے ہو ؟

شرک کی شناعت کو واضح کرنے کے لئے تورات میں مشرک کو ایک چھنال عورت سے تشبیہ دی

گئی ہے جب کہ اس کے برعکس ایک مخلص و موحد بندے کو ایک بیٹے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ انسان جس طرح دو باپوں کے تصور کو برداشت نہیں کرتا اسی طرح اپنی بیوی میں کسی دوسرے شخص کو شریک کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تورات کی ان تمثیلات کو باطل پسند طبیعتوں نے ان کے مقصد کے خلاف ایک حقیقت سمجھ لیا اور اپنے متعلق یہ دعویٰ کر دیا کہ 'نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ '

(ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں)

تورات کے برعکس قرآن نے اصل حقائق کو روشن کیا ہے اور اس نوع کی تمثیلات استعمال کرنے سے اجتناب کیا ہے جو پہلی امتوں کے لئے مزلہ قدم ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے تورات اور انجیل میں باپ اور بیٹا کے الفاظ مجازی معنی میں استعمال ہوئے' قرآن میں وہاں رب' عبد اور خلیفہ کے الفاظ سے مطلب ادا کیا گیا ہے۔

قرآن نے شرک کے ایک بے بنیاد تصور ہونے پر بھی دلیلیں دی ہیں۔ قوم سبا کی سورج پرستی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ○ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ○ (نمل ۲۵، ۲۶)	شیطان نے ان کو صحیح راہ سے روک لیا ہے کہ وہ اللہ کو سجدہ نہ کریں جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو ظاہر کرتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ پوشیدہ ہوتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرتا ہے۔ سورج محض خارج کو روشن کرتا ہے لیکن اپنی ذات کے لحاظ سے اندھا ہے اور کسی چیز کا علم نہیں رکھتا۔ اس کے بس میں یہ بات نہیں ہے کہ کسی کو بصر اور بصیرت کی روشنیاں عطا کرے۔ لیکن اللہ تعالیٰ یہ دونوں روشنیاں عطا فرماتا ہے۔ پھر سورج ایک مقتدر حاکم کی قدرت کے تحت ایک نظام میں جکڑا ہوا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ عرش کا مالک اور عظمت والا بادشاہ ہے۔

اسی آیت کی مانند دوسری آیت یوں آئی ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ (فصلت ۳۷)	اور اسی کی نشانیوں میں سے رات اور دن' سورج اور چاند بھی ہیں۔ نہ سجدہ کرو سورج کو اور نہ چاند کو' بلکہ سجدہ کرو اس اللہ کو جس نے ان ساری چیزوں کو پیدا کیا ہے۔

اس دلیل کا مدعا یہ ہے کہ مخلوق اس لائق نہیں کہ اس کی عبادت کی جائے۔ چونکہ سورج اور چاند مسخر اور ایک خاص خدمت پر لگے ہوئے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ایک حکیم و قدیر خالق کی مخلوق ہیں۔ خدا کی ذات کا کامل ہونا اور اس کا الٰہ ہونا شرک کے ابطال پر ایک دلیل کلی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لئے عبادت کا وجوب اور اس کے ہمسروں کی نفی اس بات سے ہی ثابت ہو جاتی ہے کہ وہ خالق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرمایا:

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ۭ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ○ (انعام ۱۰۰ – ۱۰۲)	اور انہوں نے جنوں میں سے خدا کے شریک ٹھہرائے حالانکہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا اور اس کے لئے بے سند بیٹے اور بیٹیاں تراشیں۔ وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کے اولاد کہاں سے آئی جب کہ اس کی کوئی بیوی نہیں۔ اور اس نے ہر چیز پیدا کی اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ وہی اللہ تمہارا رب ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں' وہی ہر چیز کا خالق ہے تو اسی کی بندگی کرو اور وہی ہر چیز پر نگران ہے۔

مطلب یہ ہے کہ خالقیت کی صفت سے اللہ تعالیٰ کا مالک و مختار ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ہر مخلوق خالق کے عبد کی حیثیت رکھتی ہے۔ چونکہ فعل تخلیق میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں اس لئے عبادت میں بھی کوئی اس کا

شریک نہیں ہو سکتا-اللہ تعالیٰ ہر چیز کا وکیل بھی ہے-یعنی ہر چیز کی کفالت اس کے ذمہ ہے-اس بارے میں چونکہ اس کے سوا کسی اور سے کوئی توقع نہیں کی جا سکتی لہٰذا اس کے سوا کسی دوسرے کی عبادت کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے-پس کوئی شخص اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کی عبادت کرتا ہے تو اس سے وہ اللہ تعالیٰ کی خالقیت کا حق ادا کرنے سے بھی انکاری ہو جاتا ہے اور وہ خدا کی اس صفت کو بھی تسلیم نہیں کرتا کہ وہ اس کا کفیل اور کارساز ہے-

---

مقالات

محمود احمد لودھی

فکر کی نارسائیاں

برٹرنیڈ رسل سے ایک بڑھیا نے سوال کیا کہ اگر مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے آمنا سامنا ہو تو کیا عذر پیش کرو گے-رسل بولے کہ میں کہہ دوں گا "اے اللہ اگر تو تھا تو نے دنیا میں اپنی شہادت نہ ہونے کے برابر کیوں رکھی تھی" -خدا جانے بڑھیا اس جواب سے مطمئن ہوئی تھی یا نہیں- مگر کیا رسل کا دل یا دماغ اس پر مطمئن تھے-؟رسل کو کہنا تو یہ چاہئے تھا کہ بڑی بی مطمئن رہیے 'سائنس دانوں نے خوب مشاہدہ اور تجربہ کر کے اور فلسفیوں اور مفکروں نے خوب غور و فکر کر کے متعین کیا ہے کہ اس کائنات میں خدا کا دور دور تک کوئی ثبوت موجود نہیں' خدا نہ کبھی تھا' نہ ہے' نہ کبھی ہو گا جو اس سے کبھی مڈبھیڑ ہو-رسل یہ کہہ نہیں سکتے تھے کیوں کہ فلسفے اور فکر کی نارسائیوں کے وہ خود بہر شاکی تھے- وہ ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے فکر انسانی اور فلسفہ کو بانجھ بنا کر رکھ دیا تھا-خدا ہے یا نہیں ہے تو اس کی صفات کیا ہیں' انسان کا خدا سے کیا تعلق ہے' نبوت کی کیا حقیقت ہے' موت کے بعد زندگی کا کیا امکان ہے-ہمارے ہم عصر فلسفیوں کا اس پر' تقریباً اجماع ہے کہ فکر انسانی کو ان مسائل پر غور و فکر سے کچھ حاصل نہیں' یہ مسائل حل نہیں کیے جا سکتے اور ہماری فکر کو ان معاملات میں کچھ دخل نہیں' لہٰذا ان سے یکسر صرف نظر کیا جائے-ان میں کف لسان کے سوا کوئی چارہ نہیں-

اب اگر اس بات کا قوی امکان ہے کہ بڑھیا اور برٹرنیڈ رسل ایک دن خدا کے حضور پیش ہوں تو غالباً بڑھیا تو یہ کہہ کر چھوٹ جائے گی کہ جب رسل جیسے مفکروں کی ہمت جواب دے گئی تھی تب بھی اس حقیر و بے بضاعت بڑھیا نے اپنی ایمان کی پونجی محفوظ رکھی مگر رسل کیا کہیں گے-دنیا کے کسی گوشے میں انہیں خدا کے وجود کی' خدا کی رحمت و حکمت کی' اس کے عدل و انصاف کی' اس دنیا کے مقصود و غایت کی کوئی شہادت نہ ملی؟انبیاء اور رسولوں کی شہادت سے رسل کو کوئی اطمینان نصیب نہ ہوا-؟ ظاہر ہے خدا کے حضور پیشی نہیں ہو گی کہ وہ خالق کائنات رہا ہو گا اور اس کائنات کے گوشے گوشے میں اس کی رحمت اور حکمت کی نشانیاں ہر آن ایک نئی شان کے ساتھ نمایاں ہوتی رہی ہوں جو رسل جیسے مفکر تو کجا ایک بڑھیا کے دل و دماغ میں ایک طوفان بپا

کر رہی ہوں - تو اس پس منظر میں رسل کیسے کہہ پائیں گے "اے اللہ تیری شہادت نہ ہونے کے برابر کیوں تھی" - کیا شہادت کی کوئی خاص نوع تھی جس کا رسل کو مطالبہ تھا' اصرار تھا' اور پوری رعونت کے ساتھ تھا؟- اور جو بھرپور شہادت موجود تھی اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی رسل کو کبھی توفیق نہ ہوئی-

جولین ہکسلے کہتے ہیں کہ آج کے ذہین مرد و عورت کے لئے یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ توحید و رسالت کے چکر میں پھنس کر فکری آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھیں - ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر خدا ایک بدیہی حقیقت ہے اور وہ اپنی رحمت' حکمت اور عدل کے ساتھ جلوہ گر ہے اور طالبان ہدایت کی دعاؤں کے جواب میں وہ اپنے انبیاء اور رسل کے ذریعے خلق کی ہدایت کا سامان بھی کرتا ہے تو ایک ذہین و فطین آدمی کے لئے اس میں کیا حرج ہے کہ وہ اپنی آزادی فکر سے کام لیتے ہوئے حق پرستی کو اختیار کرے-

آخر آزادی فکر کا یہ کوئی سوء استعمال تو نہیں ہے کہ جہاں حق اور باطل میں 'بدیہی حقیقت اور ڈھکوسلوں میں انتخاب کا معاملہ ہو تو ہمارا ووٹ ہمیشہ حق اور صداقت کے لئے ہو - اگرچہ آزادی فکر میں باطل اور بے بنیاد ڈھکوسلوں کو اختیار کرنے کی آزادی بھی شامل ہوتی ہے لیکن ایسا صرف نظری حد تک ہوتا ہے ورنہ کون ذی ہوش اپنی آزادی کے اظہار اور نمائش کی خاطر باطل کو اختیار کرے گا اور تمام اہل نظر کے سامنے نکو بن کر رہ جائے گا-

اور پھر غور و فکر کچھ بانجھ تو نہ ہو جائیں گے اور نہ آزادی فکر سلب ہو جائے گی- آخر صفات الٰہی پر بھرپور غور و فکر ہی علم و یقین میں اضافے کا سبب بنے گا اور مجنون' مفتری جھوٹے اور سچے نبی اور رسول میں فرق و امتیاز تو عقل و ہوش کے صحیح استعمال ہی سے ہو پائے گا- اور پھر رسولوں سے حاصل ہونے والی ہدایت اور دانش و حکمت پر تدبر ہی سے حق اور خیر کی راہیں کھلیں گی-

علم اور ذہانت بڑی نعمتیں ہیں جو آدمی کے لئے فتنہ تبھی بنتی ہیں جب غرہ علم اور غرور ذہانت اسے حق کو قبول کرنے سے روکیں - ہکسلے بھی مانیں گے کہ اگر ہماری منزل حق و صداقت ہے تو ہمیں اپنے علم و ذہانت اور دوسرے ذرائع و وسائل کو اسی معیار پر جانچنا ہو گا کہ وہ ہمیں ہماری منزل تک کس خوبی اور کس راست قدمی سے پہنچاتے ہیں- حق ایک ہے اور باطل متنوع' اب ہم بیاباں نوردی کو شوقیہ تو اختیار کرنے سے رہے - اور یہ تو ایک نادان ہی کو زیب دیتا ہے کہ اس کا تجسس اسے نئی نئی وادیوں میں سرگرداں کئے رکھے یہاں تک کہ وہ اپنی منزل کا نشان ہی کھو بیٹھے اور بچوں کی طرح فخریہ دعوے بھی کرتا پھرے کہ اس نے سینکڑوں ہزاروں خیالی وادیوں کا سراغ لگا لیا ہے- آج کے ذہین و فطین مرد و عورت کی بھی وہی منزل ہے جو کل کے ذہین آدمی کی تھی اور وہ ہے حق و صداقت اور اس کے سامنے اپنے عجز کا اعتراف-

تبصرہ کتب

تزکیۂ نفس - جلد دوم

تزکیۂ نفس - جلد دوم
تالیف - مولانا امین احسن اصلاحی
شائع کردہ - فاران فاؤنڈیشن ۱۲۲ فیروز پور روڈ لاہور
قیمت - ۳۶ روپے

بیسویں صدی کے نصف النہار میں برصغیر کے علمی افق پر جن باکمال علمی شخصیات نے اپنے علوم و افکار سے درخشندہ روایات کو جنم دیا ان میں مولانا امین احسن اصلاحی کے نام کو ان کی متنوع خدمات کے باعث فراموش نہیں کیا جا سکے گا- ان کے علمی کارناموں میں ہر کاوش اپنے مقام پر اہمیت کی حامل ہے مگر ان کی تفسیر "تدبر قرآن" اور تصنیف "تزکیہ نفس" کو ان کے گلستان افکار میں گل سرسبد کی حیثیت حاصل ہے-

مولانا امین احسن اصلاحی نے تفسیر قرآن کے جس اسلوب کی آبیاری کی وہ قرآن مجید کو خود قرآن ہی کے حوالے سے سمجھنے کی ایک کامیاب کوشش ہے- شرک 'توحید 'نماز اور تقوی کے حقائق کے موضوعات پر ان کا سلسلہ تصانیف ایک مخصوص علمی شان رکھتا ہے- "دعوت دین اور اس کا طریق کار" اسلامی تحریکوں کے کارکنان کے نصاب تربیت میں شامل ہو چکی ہے- اسلامی ریاست اور قانون کے حوالے سے ان کی نگارشات نے روح عصر کے تناظر میں اسلام کی کامیاب وکالت کی ہے- عصری مسائل پر ان کی تنقیدات 'توضیحات' اور مقالات مولانا کے مخصوص علمی اور استدلالی اسلوب کے شاہد عادل ہیں-

۱۹۵۷ء میں مولانا اصلاحی نے ایک متعین خاکے کے تحت تزکیہ نفس کے موضوع پر تربیتی لیکچر دینا شروع کئے جن کا حصہ اول تزکیہ علم کے مباحث پر مشتمل اسی سال شائع ہوا- بعد میں انہوں نے کتاب میں تزکیہ عمل

کے مباحث کا اضافہ کیا اور کتاب کا نیا ایڈیشن ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ اس کے اٹھائیس سال بعد اب تزکیہ تعلقات کے عنوان سے مولانا کی ایک ایسی تحریر سامنے آئی ہے جس کی روایت سے اردو زبان کا دامن ابھی تک ناآشنا تھا۔ یہ تحریر پہلے رسالہ تدبر میں شائع ہوئی اور اب کتابی شکل میں تزکیہ نفس حصہ دوم کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں تزکیہ تعلقات و معاملات کے مختلف پہلوؤں پر کتاب و سنت کی روشنی میں بنیادی تعلیمات پیش کی گئی ہیں۔ تزکیہ نفس کی جلد اول کے اسلوب میں ایک شدت کا احساس ہوتا ہے مگر جلد دوم کے طرز نگارش میں محکم دلائل نمایاں ہیں اور واضح فکر کو بہت دلنشیں انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

تزکیہ نفس کا موضوع وہی ہے جو عرف عام میں تصوف کے مضامین ہیں مگر تصوف خواہ اس کی اساس کو حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم یا خلیفہ الرسول حضرت ابو بکر صدیق یا خلیفہ چہارم سیدنا علی رضی اللہ عنہم کے توسل سے پیش کیا جائے، عالم اسلام میں شروع دن سے ایک متنازعہ موضوع رہا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ قرآن مجید کا سب سے اہم موضوع خود نفس انسانی کی ماہیت اور اس کا تزکیہ ہے اور تصوف میں بھی نفس کی اصلاح و تربیت ہی کو موضوع بنایا گیا ہے مگر یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ اہل تصوف نے قرآن مجید کی باطنی تفسیر اور احادیث کے ایک مخصوص روحانی پیرائے میں ایسی تعلیمات کو پیش کیا ہے جن کا کتاب و سنت کے ذخیرے سے کوئی واضح تعلق نہیں ہے۔ تصوف میں بلاشبہ اشاعت دین اور فرد کے روحانی تشخص کے موضوع پر متقدمین نے اہم خدمات پیش کی ہیں اور مولانا ممدوح نے ان کا اعتراف بھی کیا ہے مگر اہل تصوف نے بالعموم اور خوارج، اثنا عشری، باطنی اور بابی مسالک کے اہل علم نے بالخصوص تزکیہ نفس کے جو اصول پیش کئے انہیں کسی طرح بھی کتاب و سنت کی رو سے درست نہیں کہا جا سکتا۔

اس کے برعکس کتاب "تزکیہ نفس" کی سب سے بڑی اور اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں صوفیانہ زندگی کی عجمی اور غیر شرعی رسوم و روایات کی غیر حکیمانہ تاویل و تعبیر کی بجائے صاف صاف تربیت نفس کا وہ ضابطہ اور منہاج واضح کیا گیا ہے جو کتاب و سنت کے گہرے مطالعہ سے سامنے آتا ہے اور جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف خود اختیار فرمایا بلکہ تمام صحابہ کرام کی بھی اسی پیرائے میں تربیت فرمائی۔ یوں اس کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو یہ تحقیقی اور دعوتی اسلوب بذات خود مروجہ تصوف پر ایک زبردست تنقید کا درجہ رکھتا ہے۔ تصوف کا یہ معمول کہ فرد اپنی اصلاح کے لئے دنیا سے الگ تھلگ ہو کر عائلی زندگی کے جھمیلوں سے دور اور معاشرتی روابط سے کٹ کر خانقاہی مزاج کو اختیار کرے، اس کی تعلیم نہ تو ہمیں اسوہ رسول میں ملتی ہے اور نہ ہی یہ کتاب و سنت کا منشا ہے۔ ہمارے ہاں مخصوص حلیہ و ہیئت کے افراد نے انفرادی اصلاح کے لئے جو ذرائع اور اسالیب اختیار کئے ہیں ان کے نقوش کتاب و سنت میں عنقا ہیں البتہ ادیان غیر سماوی میں ان کا ایک نقشہ ضرور مل

جاتا ہے۔ اس طرح سے مروجہ تصوف کے فکری ڈانڈے غیر اسلامی عجمی تہذیبوں اور غیر آسمانی مذاہب کی تعلیمات سے جا ملتے ہیں۔

مولانا اصلاحی کا یہ بیان ایک واضح حقیقت پر مبنی ہے کہ تزکیہ کا جو مفہوم انہیں کتاب و سنت کے مطالعہ، اسوہ رسول اور صحابہ کرام کی پاکیزہ اور مثالی زندگیوں میں نظر آیا اسے انہوں نے بلا کم و کاست اپنی اس تصنیف میں پیش کر دیا ہے۔ اس نظام تزکیہ میں سب سے پہلے عقیدہ و علم کی اصلاح ہوتی ہے، پھر عمل کی اصلاح و تربیت کے لئے اسوہ رسول کا ایک جامع نقشہ صحیح ترین روایات کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے۔ یوں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج محض خالی رسوم ہونے کی بجائے گہری حکمت پر مبنی اور مخصوص مقاصد تربیت کی حامل عبادات ہیں۔ فرد کو جس معاشرے میں زندگی بسر کرنا ہے اس کی مختلف جہتوں کے پیش نظر اسے واضح اور قابل عمل احکام دیے جاتے ہیں۔ ان احکامات کے ذریعے اس کا تعلق بیک وقت خالق اور مخلوق کے ساتھ جڑتا ہے جس سے تزکیہ نفس کا عمل انفرادی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اجتماعی شان اختیار کرتا ہے اور یہی کتاب و سنت کا مقصود ہے۔

تزکیہ نفس جلد دوم کے مضامین اٹھارہ ابواب میں ۲۱۷ صفحات پر محیط ہیں۔ پہلا باب ایمان اور اسلام سے متعلق ہے۔ ایمان کا تعلق عقائد سے اور اسلام کا تعلق اعمال سے ہے۔ ان کا لزوم ناگزیر ہے۔ دوسرے باب میں تعلق باللہ اور اس کی اساسات سے بحث کی گئی ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہمیں اپنے آپ کو خدا کی صفات کے تقاضوں کے مطابق بنانا چاہئے اور صوفیا کی زبان میں خدا کی صفات کا مظہر بننا دین و شریعت میں مطلوب نہیں ہے۔ بعد کے گیارہ ابواب میں خدا کے ساتھ بندے کے تعلق اور ایمان کے لوازم کی تشریح ہے۔ ایمان کے لوازم میں شکر، عبادت، اطاعت، اخلاص، محبت، خوف، حیا، وفا، حمیت، حمایت اور جہاد کی نوعیت و کیفیت کو آیات قرآنی اور احادیث مبارکہ کے حوالے سے سمجھانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ان موضوعات کی وضاحت میں جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے وہ فلسفہ و کلام کی بجائے بہت واضح، سلیس اور دو ٹوک ہے۔ قرآن مجید میں ان موضوعات کے بارے میں کیا رہنمائی ملتی ہے اور احادیث ان کو کیسے نکھارتی ہیں، ان ابواب میں یہ تعلیمات صاف صاف سامنے آ گئی ہیں۔ کتاب کے آخری چھ ابواب میں مختلف سطحوں پر انسان کے تعلقات کی نوعیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ انسان کا سب سے گہرا تعلق خود اپنے نفس کے ساتھ ہے۔ نفس کے حقوق میں معرفت حق، تربیت نفس، عزت نفس اور احتساب نفس کی بحث کو بہت عمدہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔ پھر آدمی کا تعلق اس کے کنبے خاندان، معاشرہ، ریاست، والدین، بیوی بچوں، غربا، یتامیٰ اور پڑوسیوں کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ ان عنوانات کے تحت کتاب و سنت کی تعلیمات کا نچوڑ سامنے لایا گیا ہے۔

کتاب کے آخری دو ابواب اپنی فکری گہرائی اور عملی رہنمائی کے اعتبار سے لائق ذکر ہیں۔ ان میں انسان کے معاشرہ اور ریاست کے ساتھ تعلقات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ پھر معاشرتی تعلقات کے سہ گانہ مراحل دعوت، ہجرت اور جہاد کی نوعیت، مقام اور ضرورت پر بحث کی گئی ہے۔ ریاست کے ساتھ ایک مسلمان فرد کا تعلق کیا اور کیسا ہونا چاہئے اس کی چار مثالیں دے کر دینی احکام کو واضح کیا گیا ہے۔ ایک غیر مسلم حکومت میں مسلمان اپنے عقیدہ و مسلک کو کس طرح بروئے کار لائے۔ ایک ایسی حکومت میں، جو دینی اقدار کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا چاہتی ہو، مسلمان کے لئے ارتداد یا جہاد و ہجرت کے علاوہ کوئی اور راستہ باقی نہیں رہتا۔ پہلی راہ پر چلنا مسلمان کے لئے ممکن نہیں، دوسری راہ ہمیشہ اس کے شایان شان رہی ہے اور رہے گی۔ تیسری قسم کی حکومت وہ ہے جو صرف زبانی اسلام کا نام اور نعرہ بلند کرتی ہے اور عملاً انفاذ اسلام کے لئے مخلص نہیں ہے۔ ایسے ماحول میں ایک راست رو مسلمان پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔ حکومت کی چوتھی قسم وہ آئیڈیل اسلامی حکومت ہے جو اگرچہ اس وقت موجود نہیں مگر ہمیشہ سے ایک مسلمان کا مطمع نظر رہی ہے۔ صدر اول میں اس کی مکمل جلوہ گری دکھائی دیتی ہے۔ بعد میں سلاطین کے عہد میں اس کی مختلف جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ان چار قسم کی حکومتوں میں ایک بندہ مومن کا تعلق کیا اور کیسا ہونا چاہئے، اس کا ایک مجمل مگر واضح جواب اس آخری باب کی زینت ہے۔ یوں تزکیہ تعلقات میں خدا کی ذات سے لے کر معاشرے اور ریاست میں جتنے اور جیسے بھی شعبے یا دائرے ہو سکتے ہیں ان سب کے ساتھ تعلقات کی اسلامی نہج کیا اور کیسی ہونی چاہئے ان کی ایک جامع تفصیل اس کتاب کا امتیاز ہے۔

الغرض "تزکیہ نفس" اسلامی موضوعات میں سے ایک ایسے موضوع پر استناد کا درجہ رکھتی ہے جس پر کچھ لکھنا کانٹوں کی ایک سیج ہے۔ اس موضوع پر جو صوفیانہ لٹریچر فراہم کیا گیا ہے انصاف پسند حضرات دیکھ سکتے ہیں کہ اس میں رطب و یابس، آسمانی اور غیر آسمانی، دینی اور عجمی سب قسم کے حوالوں کو یوں گڈمڈ کر دیا گیا ہے کہ جس سے اس موضوع کی اصل تصویر غائب ہو کر ابسٹریکٹ آرٹ بن گئی ہے جس سے ہر شخص کو من مانی تاویل و تشریح کا ایک غیر شرعی ہتھیار ہاتھ آ گیا ہے جس کے استعمال نے ملت اسلامیہ کو عقیدہ و عمل کے وہ چرکے لگائے ہیں کہ جن کے اندمال کی اردو زبان میں یہ سب سے موثر اور بھرپور علمی کوشش و کاوش ہے۔ کاش کوئی اس کتاب کو عربی اور انگریزی زبانوں میں ترجمہ کر کے اس کی افادیت کے دائرے کو وسیع تر کر دے۔ حق تعالیٰ اس کوشش کو شرف قبول بخشے اور اس کو ملت اسلامیہ کی دینی اور اخلاقی تربیت کا ذریعہ بنائے آمین۔

(پروفیسر عبدالجبار شاکر)

تالیفاتِ امام حمید الدین فراہیؒ

	روپے پیسے
۱. مجموعہ تفاسیر فراہی	-- ..
۲. اقسام القرآن	۸ - ۰۰
۳. ذبیح کون ہے	۸ - ۰۰

تالیفاتِ مولانا امین احسن اصلاحی

۱. تدبر قرآن : (مکمل سیٹ : ۹ جلد)	۱۱۲۵ - ۰۰
: فی جلد	۱۲۵ - ۰۰
۲. مبادئ تدبر قرآن	۳۶ - ۰۰
۳. اسلامی قانون کی تدوین	۰۰ - ۰۰
۴. اسلامی ریاست	۰۰ - ۰۰
۵. اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل	۱۶ - ۰۰
۶. قرآن میں پردے کے احکام	۴ - ۰۰
۷. تنقیدات	۱۸ - ۰۰
۸. توضیحات	۲۱ - ۰۰
۹. تزکیہ نفس : جلد اول	۵۰ - ۰۰
: جلد دوم	۳۶ - ۰۰
۱۰. مبادئ تدبر حدیث	۳۶ - ۰۰
۱۱. دعوتِ دین اور اس کا طریق کار	۴۰ - ۰۰
۱۲. اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام	۴۰ - ۰۰
۱۳. حقیقتِ شرک و توحید	۵۶ - ۰۰
۱۴. حقیقتِ نماز	۲۴ - ۰۰
۱۵. حقیقتِ تقویٰ	۲۴ - ۰۰

فاران فاؤنڈیشن

۱۲۲ - فیروز پور روڈ، اچھرہ، لاہور ــ ۵۴۶۰۰ - پاکستان - فون : ۷۷۴۳۴۳